بسم اللہ الرحمن الرحیم

لمعات

رویتِ ہلال اور ''علمائے کرام''

جن مہینوں کے ہلال کو ہمارے معاشرے میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان میں شاید ہی کوئی مہینہ ایسا ہو جس کی رویتِ ہلال میں ہر سال اختلاف نہ ہوتا ہو۔ اس اختلاف کو دور کرنے کی اپیل کیجئے تو فوراً ایک ''حدیث'' پڑھ کر سنا دی جاتی ہے کہ ''اختلاف امتی رحمۃ'' (میری امت کا اختلاف رحمت ہے) صحاح' سنن' مسانید' موطات' مصنفات' معاجم غرض دنیا کی کسی کتابِ حدیث میں یہ حدیث موجود نہیں لیکن اسے خوب اچھالا گیا ہے جس کا مقصد اس کے سوا ور کچھ نہیں کہ اختلافات باقی رہیں اور پارٹی لیڈرشپ پر زد نہ آئے۔ اگر گروہی جھگڑے بالکل ختم ہو جائیں تو بہت سے لوگوں کی سیادت و قیادت بلکہ ان کا وہ مصرف ہی ختم ہو جاتا ہے جس سے ان کا مفادِ عاجل وابستہ ہے یہ جھوٹی اور جعلی روایت (اختلاف امتی رحمۃ) کچھ اس انداز سے پیش کی جاتی ہے کہ گویا اتحادِ امت رحمت نہیں ہے۔ صرف اختلافِ امت ہی سراپا رحمت ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ رمضان اور عیدالفطر ہی میں نہیں بلکہ عیدالضحیٰ کے دس دنوں میں بھی یہ حضرات رویتِ ہلال کی صحیح تاریخ نہیں معین کر پاتے۔

چند برس پیشتر کا واقعہ ہے کہ پنجاب کے ایک شہر میں ۲۹ کے حساب سے سرکاری اعلان کے مطابق ایک مولوی صاحب نے نماز عید پڑھائی۔ ایک دوسرے مولوی صاحب نے اعلان فرمایا کہ یہ نماز باطل ہے کیونکہ اول تو یہ سرکاری عید ہے اور دوسرے یہ مولوی دیوبند ہے۔ جس کے کفر میں شک کرنا ہی کفر ہے۔ غرض ان مولوی صاحب نمبر۲ نے دوسرے دن عید کی نماز پڑھائی۔ اس کے بعد ایک اور صاحب نے اعلان فرمایا کہ یہ مولوی نمبر۲ بھی مشرک ہے کیونکہ بریلوی مولوی ہے لہٰذا یہ نماز نمبر۲ بھی باطل ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے تیسری نماز ادا فرمائی۔ آپ کو نہ پہلی عید پر اعتراض کا حق ہے نہ دوسری اور تیسری نماز عید پر۔ کیوں! اس لئے کہ اختلاف امتی رحمۃ۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ہر روز کی اس بیکار کی الجھن کو بالکل ختم کر دیا جائے اور اس کی صرف ایک شکل ہے اور وہ یہ

ہے کہ فلکی حساب پر اعتماد کر کے اعلان کر دیا جائے کہ فلاں دن سے فلاں مہینہ شروع ہوگا ہمارے علمائے کرام کو فلکیات کے علم پر غالباً کوئی اعتماد نہیں کیونکہ حدیث شریف میں صرف اتنا آیا ہے کہ صوموا لرویة وافطروا لرویة۔ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر عید کرو۔

ایک امی اور سادہ ترین تمدن رکھنے والی امت کو اس سے زیادہ اور کیا بتایا جا سکتا تھا؟ جو امت لکھنا پڑھنا بھی نہ جانتی ہو اس کے لئے بجز ''رُویت'' کے اور کیا طریقہ تجویز فرما سکتے تھے۔ وہاں فلکی تقویم کے وہ اکتشافات موجود نہ تھے۔ نیز اس وقت رویت کا بدل صرف ایسی عینی شہادتیں ہوسکتی تھیں جو قرب و جوار سے حاصل ہو جائیں اور اس قرب و جوار کی مسافت اتنی مختصر و محدود ہو کہ ایک انسان۔۔۔ پیدل یا سوار۔۔۔ آسانی سے چند گھنٹوں میں خبر لے کر آ جائے۔ اب حالات بدل چکے ہیں۔ رسل و رسائل کا یہ حال ہے کہ ہزاروں میل سے چوتھائی سیکنڈ میں خبریں آ جاتی ہیں۔ مسافت اتنی سکڑ گئی ہے کہ مہینوں کا راستہ گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔ فلکی علوم اور تقویمات کا یہ عالم ہے کہ اب وثوق کے ساتھ معلوم ہے کہ:

(۱) ۲۹ دن، ۱۲ گھنٹے، ۴۴ منٹ اور ۱۷ اعشاریہ ۸ سیکنڈ میں چاند اپنی گردش پوری کر لیتا ہے۔

(۲) ۳۶۵ دن ۶ گھنٹے ۹ منٹ اور ۹۔ اعشاریہ ۵ سیکنڈ میں زمین اپنی مداری گردش پوری کر لیتی ہے۔

اور آج پورے وثوق کے ساتھ مہینوں پہلے یہ پیشگوئی کر دی جاتی ہے کہ

(۳) اتنے بج کر اتنے منٹ اور اتنے سیکنڈ پر فلاں جگہ چاند گرہن یا سورج گرہن لگنا شروع ہوگا۔ اور چاند یا سورج کے اتنے حصے پر گہن لگے گا اور پھر کم ہونا شروع ہوگا۔ اور اتنی دیر تک فلاں جگہ اور اتنی مدت تک فلاں جگہ گہن قائم رہے گا۔

اس موقع پر ہماری طرف سے کچھ سننے کے بجائے صبحی محمصانی کی زبان سے سنئے وہ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے کہ امعلول یدور مع علته وجودا وعدما (معلول اپنی علت کے ساتھ موجود و معدوم ہوتا ہے) لکھتے ہیں کہ:

(عربی سے ترجمہ) ''اور اسی قاعدے کی بنیاد پر بعض فقہا نے فلکی حساب سے اسلامی مہینوں خصوصاً رمضان کے ہلال کی تعیین کو جائز قرار دیا ہے اور اس کی تشریح یوں کی ہے کہ وہ حدیث جس میں روزے کے متعلق صرف رویت ہلال پر اعتماد کرنے کا حکم ہے ایک منصوص علت کے ساتھ وابستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ (مخاطب) امت امی واقع ہوئی تھی جو لکھنا اور حساب کتاب کرنا نہیں جانتی تھی۔ لہٰذا جب یہ امت امیت سے نکل کر لکھنے پڑھنے اور حساب و کتاب کے لائق ہوگئی اور لوگوں کے لئے ہلال کے حساب میں یقین اور قطعیت تک پہنچنے کا امکان و سامان پیدا ہو گیا تو اس عمومی صورت حال کے ہوتے ہوئے اور امیت کی علت ختم ہونے کے بعد اب یہی ضروری ہے کہ لوگ اس (حسابی) قطعیت و یقین کی طرف رجوع کریں۔ اور ہلال کو معلوم کرنے کے لئے تنہا (فلکی) حساب و کتاب کا طریقہ اختیار

کریں اور رویت کے (سابق طریقے) کی طرف وہیں رجوع کریں جہاں فلکیات کا جاننا دشوار ہو۔''

محمصانی نے یہ پوری عبارت اپنی مشہور عالم کتاب ''فلسفۃ التشریع'' میں احمد شاکر کی کتاب ''اوائل الشہور العربیۃ'' سے نقل کی ہے جو اسی مضمون پر لکھی گئی ہے کہ اب ہلال کے معاملہ میں فلکی حساب پر بلا تامل اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس عبارت سے جو نکات معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ:

(۱) معلول ہمیشہ اپنی علت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

(۲) ہلال دیکھ کر صوم و افطار کا حکم اس امت کے لئے ہے جو امی ہو۔ اور فلکیات سے واقف نہ ہو۔ نہ خبریں پہنچائی جا سکتی ہوں، نہ اخبار وغیرہ پہنچتے ہوں۔

(۳) لیکن جہاں یہ مجبوریاں نہ ہوں وہاں بلا تامل فلکی علم کے مطابق تعیین ہلال کی جا سکتی ہے اور اسی کے مطابق اسلامی تقریبات ادا کی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ ذرا یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ آج پوری امت کس طرح اپنے بعض خالص دینی معاملات میں حساب و کتاب ہی پر اعتماد کر رہی ہے اور یہ اعتماد بالکل قابل اعتراض نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً

(۱) آج کوئی بھی سحری کے وقت اٹھ کر سیاہ اور سفید دھاری کے امتیاز کو نہیں دیکھتا۔ فلکی حساب ہی کے مطابق نقارہ یا سائرن بجتا ہے یا گولا چھوٹتا ہے اور لوگ اس پر اعتماد کرتے ہیں۔

(۲) بلکہ افطار کے وقت بھی غروب آفتاب کی رویت کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی اور فلکی ریاضیات ہی پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

(۳) اب ایک نمازی بھی سایہ ناپ کر یا اپنی آنکھوں سے شفق وغیرہ کو دیکھ کر نمازیں نہیں پڑھتا بلکہ فلکی حساب کے مطابق جو اوقات نامے مسجدوں میں آویزاں ہوتے ہیں ان ہی پر اعتماد کر کے ساری نمازیں ادا کر لی جاتی ہیں۔

غرض کئی جگہ دینی معاملے میں فلکیات پر اعتماد ہوتے ہوئے اگر ہلال رمضان وعید میں بھی فلکیات پر اعتماد کر لیا جائے تو کون سی قیامت آ جائے گی؟ قرآن کی رُو سے تو قمری اور شمسی دونوں طریقوں سے کیلنڈر مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اگر ملت کے اجتماعی مصالح کا تقاضا یہ ہو کہ شمسی مہینوں کے مطابق حساب رکھنا زیادہ منفعت بخش ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں، اگر کبھی اسلامی نظام قائم ہوا اور اس نے ایسا فیصلہ کر لیا تو پھر رویتِ ہلال کی اہمیت ہی نہیں رہے گی۔ نوع انسانی سمٹ کر ایک برادری بنتی جا رہی ہے۔ جب یہ برادری ایک خدا کے ایک قانون (قرآن) کے تابع آ جائے گی تو پھر حساب کتاب بھی اسی طرح رکھا جائے گا جس سے ان کی وحدت مستحکم ہوتی چلی جائے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شاہد مصطفیٰ

ایمان و اسلام:
امن و سلامتی اور انسان دوستی کی علامت

اسلام کے پیش کردہ نظامِ فکر و عمل اور ضابطۂ زندگی کی دو سب سے اہم اور بنیادی اصطلاحات کا تعلق امن و سلامتی سے ہے' یعنی ایمان اور اسلام۔ ایمان ''امن'' اور اسلام ''سلامتی'' سے عبارت ہے۔ چنانچہ ایمان کا مادہ ''ا۔م۔ن'' ہے' جس سے سادہ ترین لفظ امن بنتا ہے' جس کے معنی از خود واضح ہیں' یعنی بے خوفی' اطمینان' سکون اور چین۔ اسی طرح اسلام کا مادہ ''س۔ل۔م'' ہے' جس سے بے شمار الفاظ بنتے ہیں' لیکن ان سب میں مشترک جو مفہوم سامنے آتا ہے' وہ سلامتی یعنی حفاظت و عافیت ہے۔

ذرا غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ امن و سلامتی قریباً ہم معنی الفاظ ہیں' یہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ قرآن کریم نے انسان کو جو فکر و عقیدہ عطا فرمایا ہے' اس کا حسین عنوان قرار دیا ہے ''ایمان'' کو۔ جس کا ثمرہ ہے داخلی امن' یعنی ذہنی و قلبی اطمینان اور عمل کے ضمن میں صراطِ مستقیم کی جانب راہنمائی اور اس کا جامع عنوان قرار دیا ہے ''اسلام'' کو۔ جس کا اصل حاصل ہے معاشرتی سکون اور اجتماعی امن و سلامتی۔

''ایمان'' کا پس منظر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر شے میں اس کی تخلیق اور پیدائش کے ساتھ ہی ہدایت اور راہنمائی بھی رکھ دی ہے' جس کے بہت سے درجات ہیں' چنانچہ جمادات اور نباتات تو قدرت کے قوانینِ طبعی کے پابند ہیں اور ان میں ارادے و اختیار کی کوئی آزادی سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ البتہ ہم انسان میں ارادہ و اختیار کی آزادی کو نقطۂ عروج پر پاتے ہیں۔ اختیار و ارادے کا یہ شرف ہی انسان کو دیگر مخلوقات پر بلند و ممتاز کرتا ہے' چنانچہ انسانی شرافت و کرامت کی بنیاد یہی ہے کہ وہ سرتابی اور سرکشی کا اختیار رکھتے ہوئے اپنی مرضی سے اپنے خالق و مالک کی اطاعت و تابع داری کی روش اختیار کرے' بدی کی استعداد کا حامل ہونے کے باوجود نیکی کی راہ پر چلے' انتقام پر قادر ہوتے ہوئے عفو و درگزر کو اپنا شعار بنائے' اگر انسان میں ارادہ و اختیار کی یہ آزادی نہ ہوتی تو اس کی نیکی اور پارسائی کسی قدر و وقعت کی حامل نہ ہوتی' اختیار رکھتے ہوئے اپنے آپ پر قابو رکھنا ہی شرفِ انسانیت ہے۔

اسلام کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے ارادے و اختیار کی جو آزادی انسان کو عطا فرمائی ہے' انسان اپنی مرضی اور خوشی کے ساتھ اپنی اس آزادی سے اللہ کے حق میں دست بردار ہو جائے اور جس طرح اس کا کل جسمانی نظام اللہ کے قوانینِ طبعی کی گرفت میں جکڑا ہوا ہے' اسی طرح اپنی آزادی و اختیار کے دائرے میں بھی اللہ تعالیٰ کے ان احکام و ہدایت کی پابندی قبول کر لے' جو بہ ذریعہ وحی اسے ملے ہیں' کیوں کہ اس میں اس کی فلاح ہے۔

اسلام کا مرکزی تصور

اسلام کا حقیقی مقصد تمام انسانوں کے لئے بلا امتیاز قیام عدل و انصاف ہے' یعنی عدل و انصاف پر مبنی ایک ایسا نظامِ حیات' جس میں سچائی اور حق کا بول بالا ہو' انصاف اور قانون کی حکمرانی ہو' حاکم و محکوم' اعلیٰ و ادنیٰ کی تقسیم باقی نہ رہے۔

احترامِ آدمیت کے لحاظ سے سب انسان اپنے آپ کو برابر محسوس کریں' فضیلت' دولت و ثروت کی بناء پر نہ ہو' انسانی عظمت صرف اخلاق' خدمت اور جذبۂ اخوت سے ناپی جائے۔ ایمان ہی وہ

جذبۂ محرکہ ہے' جس سے افراد میں عملِ صالح کا جذبہ پیدا ہوتا ہے' جو مسلمانوں کو پہلے باہم محبت واخوت کے رشتے میں منسلک کرتا ہے' پھر انہیں اس عادلانہ نظام کے قیام کے لیے محرک اور فعال بنا دیتا ہے' چنانچہ وہ اس کے لئے اپنی جان ومال اور ہر چیز قربان کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں۔ ایمان کی طاقت کے بغیر یہ کام ساری دنیا کے انسان مل کر بھی اپنی تمام تر خواہش کے باوجود انجام نہیں دے پاتے۔

ایمان اور اسلام کا باہمی ربط

ایمان اور اسلام کے درمیان فرق کو ذیل کی مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔

اگر اسلام کو ایک عمارت سے تعبیر کیا جائے تو ایمان اس عمارت میں بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے' جس عمارت کی بنیاد کمزور ہو' یا سرے سے کوئی بنیاد ہی نہ ہو' اس پر کسی بالائی منزل کا بوجھ نہیں ڈالا جا سکتا' پائیدار اور مضبوط عمارت وہی ہوتی ہے' جس کی بنیاد پائیدار اور مستحکم ہو' اسی طرح مضبوط ایمان کی بنیاد پر اسلام کی پختہ عمارت تعمیر ہو سکتی ہے۔ ایک دوسری مثال یہ ہے کہ اگر ایمان کو بیج سے تشبیہہ دی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ جب زمین میں بیج بویا جاتا ہے' تو تمام کارخانۂ ہستی اس کی نشوونما میں لگ جاتا ہے' سورج اپنی گرمی اس کے لئے وقف کر دیتا ہے' بادل بارش سے اس کو مالا مال کر دیتا ہے' زمین اس کو نمو دیتی ہے' ہوا اپنا کام انجام دیتی ہے' لیکن یہ سب کچھ اس صورت میں نتیجہ خیز ہوتا ہے کہ خود بیج کے اندر استعداد موجود ہو' ورنہ پھر یہ تمام کارخانۂ عطا وبخشش اس کے لئے بے کار ہوگا۔ سورج اپنا دہکتا ہوا تنور رکھتے ہوئے بھی اسے گرم نہ کر سکے گا' بادل اگر تمام ذخیرہ ختم کر ڈالے' تب بھی اسے زندگی کی رطوبت حاصل نہ ہو سکے گی' پھر ایک صالح بیج زمین میں جب اپنی جگہ بنالیتا ہے تو اس کے اندر کی استعداد ظاہر ہونی شروع ہوتی ہے اور جب یہ زمین کی سطح چاک کر کے ابھرتا ہے اور پھر ایک تناور درخت بنتا ہے' تو ہم اس درخت کے وجود کا اعتراف تو کرتے ہیں' لیکن ادھر خیال نہیں جاتا کہ سب اس صالح بیج کا ظہور ہے' جو زمین میں بویا گیا تھا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اللہ پر ایمان ایک خاص قسم کے اخلاق کا تقاضا کرتا ہے اور اس اخلاق کا ظہور انسان کی عملی زندگی کے تمام گوشوں میں ہونا چاہئے' ایمان ایک ایسا مؤثر ہتھیار ہے' جو قلبِ انسان میں جڑ پکڑتے ہی اپنی فطرت کے مطابق اپنی عملی زندگی کے ایک پورے درخت کی تخلیق شروع کر دیتا ہے۔

یوں تو ایمان' بہت سی ان دیکھی حقیقتوں کو محض انبیاء اور رسولوں کی شہادت کی بنیاد پر ماننے کا نام ہے' لیکن اس کی بنیاد' اصل جوہر اور خلاصہ' ایمان باللہ ہے' یعنی اللہ کی ہستی' اس کی توحید اور اس کی صفاتِ کمال کی معرفت اور ان سب کا لب لباب اور حاصل یہ ہے کہ اللہ کی عظمت دل پر نقش ہو جائے اور انسان اس کی کبریائی کے تصور سے نہ صرف لرزہ براندام ہو' بلکہ اسکا دل حمد وثنا اور تحسین وآفرین کے جذبات سے معمور ہو جائے اور وہ بے ساختہ پکار اٹھے کہ اللہ نے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا' اس کا آسان ترین ذریعہ یہ ہے کہ اس کی تخلیق پر غور کیا جائے' اس لئے کہ کائنات کی وسعت وعظمت اور حقیقت اس خالق کی عظمت کا عکس اور پرتو ہے' اس طرح کائنات میں جاری وساری قوانینِ طبعی وتمدنی سے اللہ کی قدرت کا اندازہ ہوسکتا ہے' اس لئے اپنی عظمت اور کبریائی کو سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انفس و آفاق یعنی دنیا اور باہر کی ساری کائنات پر غور وفکر کرنے پر زور دیا ہے۔ یہ قرآن کے اس انداز اور اسلوب کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں آفاق وانفس کے تمام گوشوں اور پہلوؤں سے متعلق سائنس کے جملہ شعبوں کے ذخیرۂ معلومات کو اخذ کیا اور پھر یہ کہ انہیں ترقی دے کر بامِ عروج پر پہنچایا اور نت نئے علوم وفنون ایجاد کئے۔

آج پھر اس بات کی ضرورت ہے کہ ایمان واسلام کی اصل روح کو ازسرِنو زندہ کیا جائے اور دینِ فطرت کی تعلیمات کی ترویج واشاعت میں بھرپور کردار ادا کیا جائے۔

(بشکریہ روزنامہ جنگ راولپنڈی' جمعہ 25 جولائی 2003ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ غلام احمد پرویزؒ

کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟

کچھ عرصہ سے دنیائے مذاہب میں ایک خاص رسم سی پیدا ہوگئی ہے۔ مختلف مقامات پر وقتاً فوقتاً اجتماعات منعقد کئے جاتے ہیں جن میں مختلف ادیانِ عالم کے نمائندے اپنے اپنے مذہب کے محاسن بیان کرتے ہیں۔ ان تقاریب سے مقصد بالعموم یہ ہوتا ہے کہ اہل مذاہب ایک دوسرے کے متعلق معلومات حاصل کرسکیں اور یوں ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے جو لاعلمی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں اگرچہ اس مقصد کی عمدگی اور ان اجتماعات کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن میں نے جب کبھی ان اجتماعات کی روئیداد کو پڑھا مجھے یہ محسوس ہوا کہ ان میں (کم ازکم) اسلام کو اس کے صحیح رنگ میں بہت کم پیش کیا جاتا ہے۔ اسلام امن وسلامتی کا پیغامبر اور نوع انسانی کے لئے آیۂ رحمت ہے۔ اس لئے اس میں غیر مذاہب سے رواداری، حسن سلوک اور وسعت نظر کی تعلیم عام ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام، دیگر مذاہب کے مقابلہ میں ایک خاص افضلیت کا مدعی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ خدا کا پیغام اپنی اصلی شکل میں آج صرف قرآن کریم کے اندر ہے جو خدا کا آخری پیام اور ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات ہے جو قیامت تک کے لئے انسانی زندگی کی ہر شاخ میں قانون فطرت کے مطابق ہدایت کے سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ ان اجتماعات میں اسلام کی وسعت نظر، کشادگی ظرف، رواداری، حسن سلوک کا چرچا تو عام کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کی اس خصوصیت، یعنی اس کی افضلیت و اکملیت، برتری اور فوقیت کے متعلق ایک حرف زبان تک نہیں لایا جاتا۔ کیونکہ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ اس طرح دیگر اہل مذاہب کی دل شکنی ہوگی اور وہ اسلام کے نمائندہ کو ''متعصب اور تنگ نظر'' خیال کریں گے۔ لہٰذا رواداری اور کشادہ نگہی کے اس غلط مفہوم سے متاثر ہوکر اسلام کے نمائندوں کو، اسلام کی صحیح ترجمانی کا حوصلہ نہیں پڑتا اور وہ ان اجتماعات میں کچھ ایسے سمٹے سمٹائے، جھجکتے لجاتے ہوئے آتے ہیں!

چو زاہدے کہ بہ بزمِ شراب می آید

اس نقطۂ خیال سے، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اس قسم کی کانفرنسیں کسی بہتر نتیجہ کی طرف مخرج نہیں ہوتیں۔ بلکہ میں تو ایک عرصہ سے محسوس کر رہا ہوں کہ یہ چیز بجائے فائدے کے نقصان، کا باعث ہو رہی ہے۔ ان اجتماعات کے انعقاد

سے یہ مقصد ہو یا نہ ہو' لیکن ان کا نتیجہ یقیناً یہی مرتب ہو رہا ہے کہ رفتہ رفتہ اسلام کی اس مابہ الامتیاز خصوصیت کو پسِ پشت ڈال کر' اسے دوسرے مذاہب کی سطح پر لا کھڑا کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ واقعات آہستہ آہستہ بتا رہے ہیں کہ یہ خدشہ موہوم اور یہ احتمال قیاسی نہیں۔

اوائل جون ۱۹۴۱ء میں شولا پور کے مقام پر اسی قسم کی ایک ''تمام مذاہب کی کانفرنس'' منعقد ہوئی۔ جس کے صدر ہندو قوم کے مشہور کارکن پنڈت سندر لال جی تھے۔ اس کانفرنس میں اسلام کے نمائندہ نے جو کچھ کہا اس کی تفصیل تو معلوم نہیں ہو سکی۔ البتہ جناب صدر نے اپنے خطبہ میں پورا زور اس بات کے ثابت کرنے میں لگا دیا کہ اسلام خود تسلیم کرتا ہے کہ نجات وسعادت کی راہیں ہر مذہب میں یکساں طور پر موجود ہیں اور کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت نہیں۔ اصل مذہب ''خدا پرستی اور نیک عملی'' کی زندگی ہے اور یہ اصل ہر مذہب میں موجود ہے۔ فرق صرف شرع و منہاج (یعنی فروعات) میں ہے۔ اور یہ فرق کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ پنڈت جی نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا بلکہ شروع سے اخیر تک جناب ابوالکلام صاحب آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ (ترجمان القرآن جلد اول) سے شرح و بسط سے اقتباسات پیش کر دیئے جن سے حرفاً حرفاً ان کے دعوے کی تائید ہوتی تھی (آپ کو غالباً معلوم ہو گا کہ ہندوؤں کی طرف سے اس تفسیر کا ہندی ترجمہ بھی شائع ہوا تھا اور پنڈت جی نے اپنے خطبہ میں اس کا حوالہ پیش کیا ہے۔ مجھے نہ تو ان امیال وعواطف سے کچھ بحث ہے جو اس تفسیر کے محرک ہوئے اور نہ ان مقاصد سے واسطہ جو اس کے ہندی ترجمہ اور اس کی عام اشاعت سے پیش نظر ہیں۔ مجھے تو قرآن کریم کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ دیکھنا ہے کہ یہ خیالات قرآن کریم کی رو سے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے اس موضوع پر اس سے پیشتر بھی نجماً نجماً بہت کچھ لکھا ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پر تفصیلی طور پر لکھا جائے تا کہ ان خیالات کو عام کرنے والے یہ کہہ کر فریب خوردگی اور فریب دہی کے مرتکب نہ ہو سکیں کہ اسلام خود اس تعلیم کا موید ہے۔ اس تفصیلی بحث کی ضرورت اور بھی شدید ہو جاتی ہے جب یہ محسوس کیا جائے کہ ہمارے نوجوان طبقہ پر اس تعلیم کا کیا اثر پڑ رہا ہے۔ ''تمام مذاہب یکساں ہیں' عالمگیر سچائیاں سب میں ایک جیسی ہیں۔ خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی نجات و سعادت کی ضامن ہے۔ ہدایت خدا کی رحمت ہے جو کسی ایک گروہ کی میراث نہیں ہو سکتی۔'' وغیرہ وغیرہ خیالات ایسے نظر فریب اور خوش آئند ہیں کہ سطح بیں نگاہیں فوراً اس سحر سے مسحور ہو جاتی ہیں اور جب اس سطحی کشش و جاذبیت کو جناب آزاد جیسے مفسر قرآن کی تائید بھی حاصل ہو جائے تو اس سحر کے سحرِ حلال بن جانے میں کون سی شئے مانع ہو سکتی ہے؟

رواداری کے اس نظر فریب مفہوم اور وسعتِ نگاہ کی اس سراب آسا تفسیر کی پہلی جھلک ہمیں شہنشاہ اکبر کے دین الٰہی میں ملتی ہے۔ جس طرح وہ جذبات و مقاصد جو اس تحریک کے محرک تھے تاریخ داں حضرات سے پوشیدہ نہیں اسی طرح وہ مساعیِ جمیلہ بھی ان کی نگاہوں سے مستور نہیں جو اس اسلام سوز نظریہ کے ابطال و استیصال کے لئے مجاہدانہ انداز سے معرضِ

وجود میں آئیں۔

برہمو سماج فرقہ کی تحریک بھی قریب قریب انہی بنیادوں پر اٹھائی گئی تھی لیکن چونکہ یہ تحریک مسلمانوں کی طرف سے وجود میں نہیں آئی اس لئے وہ ہمارے دائرہ تنقید سے باہر ہے۔

اس کے بعد یہی نظریہ موجودہ سیاسی کشمکش کے طوفان میں سطح کے اوپر لایا گیا۔ اس نظریہ کی اشاعت کی موجب جناب آزاد کی تفسیر ہوئی اور اس طرح سے یہ چیز مسلمانوں میں دین کی حیثیت سے پھیل گئی۔ جناب آزاد مسلمانوں میں ایک عالم دین اور مفسر کی حیثیت سے امتیاز حاصل کر چکے تھے اور ان کی زبان اور قلم کا مسلمانوں کے دلوں پر گہرا اثر تھا۔ اس لئے اس تفسیر کا ایک عرصہ سے انتظار ہو رہا تھا۔ چنانچہ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ اس کا استقبال ہوا۔ لوگوں نے اسے آنکھوں سے لگایا' سر پر اٹھایا اور مختلف گوشوں اور متنوع حلقوں سے اس کی تعریف وتوصیف میں غلغلہ انداز نعرے بلند ہوئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جناب آزاد کے ترجمہ میں ایک خصوصیت ضرور ہے جس کی تعریف نہ کرنا بخل ہوگا۔ لیکن بحث تو ان کے اس نظریہ سے ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ کتاب کی اشاعت کے زمانہ میں وفورِ شوق اور جوشِ عقیدت کے اس والہانہ ہجوم میں کسی کی نگاہ اس طرف نہ اٹھی۔ برنگِ خود بینی نہیں بلکہ اظہار واقعہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اس اژدہامِ مدح وستائش میں یہ توفیق اللہ تعالیٰ نے راقم الحروف کو عطا فرمائی کہ جناب آزاد اور اہل نظر طبقہ کی توجہ اس بنیادی غلطی کی طرف مبذول کرائی جائے جو اس تفسیر کے ذریعہ سے عام ہونے والی تھی۔ چنانچہ مجلّہ معارف (بابت جنوری ۱۹۳۳ء) میں میرا وہ مضمون شائع ہوا جس میں تفسیر کے اس حصہ پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی تھی۔ اس مضمون کو ارباب نظر کے حلقہ میں مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے بعد مختلف گوشوں سے اس نظریہ کی مخالفت میں آوازیں بلند ہوئیں۔ اس واقعہ کو آٹھ نو برس ہو چکے ہیں چونکہ وہ تنقیدی مضامین جو اس نظریہ کے خلاف شائع ہوئے تھے لوگوں کی نگاہوں سے وقتی طور پر گذرے اس لئے ان کی یاد محو ہوتی گئی (متفرق مضامین کا اثر ہوتا بھی وقتی ہے) اور تفسیر چونکہ مستقل کتاب کی شکل میں ہے اس لئے وہ ہر وقت سامنے رہی۔ اس کے بعد بھی جب کبھی اس نظریہ کا چرچا عام ہونے لگا میں اس کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھتا رہا۔ تین برس ادھر سے کبھی کبھار مجلّہ طلوع اسلام میں بھی اس کا تذکرہ چھڑتا رہا۔ لیکن بایں ہمہ' یہ وقتی کوششیں ایک مستقل تصنیف کے مقابلہ میں زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکتیں تاوقتیکہ انہیں بہ تسلسل جاری نہ رکھا جائے' بالخصوص جبکہ اس نظریہ کی اشاعت میں غیر مذاہب کے لوگ بھی کوشاں ہوں۔ میرے نزدیک اسلام کے لئے یہ نظریہ بہت بڑا خطرہ اپنے اندر رکھتا ہے اس لئے کہ جب آپ ایک مرتبہ یہ تسلیم کر لیں کہ اسلام میں دیگر مذاہب کے مقابلہ میں کوئی مابہ الامتیاز خصوصیت نہیں تو اس کے بعد اسلامی نظام زندگی سے شیفتگی اور اس کی سرفرازی کے لئے آرزوئیں اور کوششیں سب ختم ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ آپ کی تمام سیاسی جدوجہد' جسے اس قدر اہمیت حاصل ہے' بھی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ قوموں کی زندگی کا راز ان کے عقیدہ (نصب العین

حیات) سے وابستہ ہے۔ جس قدر کسی قوم کا مطمح نگاہ (عقیدہ) بلند اور اس کے افراد کو جس قدر اس سے عشق ہوگا' اتنی ہی وہ قوم زندگی کی دولت سے بہرہ یاب ہو گی۔ نظریۂ حیات (عقیدہ) کی ایک ذرا سی غلطی قوم کو کہیں سے کہیں لے جاتی ہے۔ گاڑی جب کانٹا بدلتی ہے تو دونوں لائنوں میں انچ بھر کا غیر محسوس سا فرق ہوتا ہے۔ لیکن اس کانٹا بدلنے میں اگر ایک نمبر کی بھی غلطی ہو جائے تو تھوڑے عرصہ کے بعد وہ گاڑی نہ صرف اپنی منزل ہی سے کوسوں دور ہو جائے گی بلکہ اسے ہر قدم پر ہلاکت اور تباہی کا سامنا ہوگا۔ میرے نزدیک جناب آزاد کا نظریہ ایک ایسی ہی ہلاکت آفریں غلطی ہے جو اگر بدستور قائم رہی تو نہ معلوم کسی وقت کیا رنگ لا کر رہے۔ یہی وہ احساس ہے جو مجھے بار بار اس موضوع پر لکھنے کے لئے آمادہ کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ صاحب! آج کل دوسرے مذاہب کے پیرو اس روش پر آ رہے ہیں کہ وہ اپنے ہی مذہب' کو سب سے اعلیٰ و ارفع نہیں بتاتے بلکہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا مذہب بھی باقی مذاہب جیسا ہے۔ اس طرح سے وہ رنگ خود بخود بدل رہا ہے جس میں مباحث و مناظرات کے اکھاڑے قائم ہوا کرتے تھے اور ہر مذہب والا اپنے مذہب کی اولیت و افضلیت ثابت کرنے میں نبرد آزمائی کرتا تھا۔ دوسرے مذاہب والوں کا تو یہ مسلک ہے اور ادھر یہ حالت ہے کہ مسلمانوں کو پھر اسی مقام پر پہنچ جانے کی تلقین کی جا رہی ہے! اس میں شبہ نہیں کہ ناروا بحث و جدل عمدہ نتائج کی حامل نہیں ہوتی اور میں اس سے ہمیشہ اجتناب کرتا ہوں۔ لیکن معترض حضرات ذرا سوچیں تو سہی کہ وہ کیا فرما رہے ہیں؟ جس چیز کو وہ دیگر اہل مذاہب کی وسعتِ نگاہ اور مسلمانوں کی تنگ نظری قرار دے رہے ہیں' اس کی اصلیت کیا ہے؟ یوں سمجھئے کہ (مثلاً) زید کا ایک بچہ ہے بڑا غبی اور نالائق۔ عمر کا ایک بچہ اس کے مقابلہ میں بڑا ذکی اور ذہین ہے۔ زید ہر مقام پر کہتا پھرتا ہے کہ صاحب! میں تو کبھی یہ نہیں کہتا کہ میرے بچہ کو کوئی خاص افضلیت حاصل ہے۔ میرے نزدیک تو میرا اور عمر کا بچہ بالکل یکساں ہیں۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہ تو عمر کی خود ستائی ہے کہ اپنے بچہ کے برابر کسی اور کو سمجھتا ہی نہیں!۔

فرمائیے کہ یہ اصول زید کی وسعتِ نظر اور عمر کی تنگ دامنی کا آئینہ دار ہے یا کسی اور حقیقت کا غماز؟ دور حاضر میں زمانے کے تقاضوں سے ہوا یہ ہے کہ اسلام کے سوا باقی تمام ادیان کو دقت پیش آ رہی ہے کہ نہ ان کے معتقدات علم و عقل کے مقابلہ میں ٹھہر سکتے ہیں نہ ان کے اصول و ضوابط انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات اور گوناگوں مقتضیات کے لئے کوئی حل پیش کر سکتے ہیں چنانچہ انہیں آئے دن اپنی عملی ضروریات کے لئے ادھر ادھر سے اصول و قوانین مستعار لینے پڑتے ہیں۔ اسلئے وہ مذاہب انسان کی برق رفتار ترقی کا ساتھ دینے سے قطعاً قاصر ہیں۔ رفتہ رفتہ ان مذہب کے ماننے والوں کی حالت یہ ہوتی جا رہی ہے کہ انہیں نہ اپنے عقائد پر یقین رہا ہے اور نہ ہی اپنے مذہب سے وابستگی۔ وہ مذہب سے برگشتہ ہو رہے ہیں اور ان کی یہ برگشتگی بعض صورتوں میں سرکشی اور بغاوت میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ قوم کی زندگی کا راز عقائد سے وابستگی میں مضمر ہے۔ اس لئے ان مذاہب کے ارباب حل

وعقد کو خطرہ ہے کہ کہیں اس طرح رفتہ رفتہ یہ شیرازہ ہی منتشر نہ ہو جائے اس کے مقابلہ میں وہ خود دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کس طرح انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ دیتا ہے۔ انہیں خطرہ ہے کہ ان حالات کے پیش نظر ان کے مذہب کے پیروؤں کا سمجھدار طبقہ اسلام کی طرف مائل نہ ہو جائے۔ ان حالات کے ماتحت وہ خوب سمجھتے ہیں کہ ان کے اپنے مذہب گزیدہ نوجوانوں سے یہ کہنا کہ ان کا مذہب تمام مذاہب عالم سے اعلیٰ و افضل ہے' کس قدر بے نتیجہ اور بے معنی ہے۔ اس لئے انہوں نے اس خطرہ سے بچنے کی وہی راہ نکالی ہے جو زید نے اپنے بچہ کے متعلق اختیار کی تھی۔ انہوں نے یہ کوشش شروع کر دی ہے کہ اگر ان کا مذہب اتنا اونچا نہیں جا سکتا جہاں اسلام ہے تو یہی کیا جائے کہ اسلام کو اس کی سطح سے نیچے اتار کر اپنے مذہب کی سطح پر لا کھڑا کیا جائے اور اس طرح ان کے اپنے مذہب سے برگشتہ ہونے والوں کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ مذاہب سب ایک جیسے ہیں اس لئے اپنے مذہب سے یہ سمجھ کر بیزار نہ ہو جائیے کہ اس سے بہتر مذہب بھی دنیا میں موجود ہے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ مذاہب کا دائرہ پرستش اور عبادت تک محدود ہے۔ اس اعتبار سے سب یکساں ہیں۔ باقی رہا نظام زندگی سو وہ مذہب سے الگ شے ہے' اسے قوم کی اجتماعیت تشکیل دیتی ہے۔ اس لئے اس اعتبار سے قومیت ہی وہ نقطہ ہے جس سے متمسک رہنے میں راز حیات ہے۔ ان زیرک حضرات نے اس طرح اس آنے والے خطرہ سے اپنی قوم کو بچا لیا ہے یعنی اپنے مذہب کی کمزوری کو ''وحدت ادیان'' کے نقاب میں چھپا لیا اور قوم کی اجتماعیت کے لئے ایک دوسرا محاذ (قومیت) تلاش کر لیا۔

یہ ہیں وہ مقتضیات و عواطف جن کے ماتحت ''یکسانیتِ مذاہب'' کی یہ تحریک وجود کوش ہوئی ہے۔ آپ مختار ہیں کہ اس کا نام جو جی میں آئے رکھ لیجئے۔ لیکن ذرا اس کی کیفیت قلب کا بھی تو احساس کیجئے جو یہ مانتا ہو کہ یہ زمانہ آنا تھا جس میں تمام مذاہب والے اپنے اپنے مذہب کے ناقص ہونے کے اعتراف پر مجبور ہو جائیں۔ یعنی زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات انہیں اس امر کے اعتراف پر مجبور کر دیں کہ ان کا مذہب واقعی زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں اسلام کے دین حقیقی ہونے کا دعویٰ علیٰ وجہ البصیرت دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکتا اور یوں اس کی افضلیت و اکملیت کا اقرار لیا جا سکتا تھا۔ یہی وہ حالات تھے جن میں قرآن کے اس دعوے کو ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آنا تھا کہ

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون○

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ حیات اور نظامِ حقیقی دے کر بھیجا تاکہ وہ نظام تمام نظامہائے عالم پر غالب آ جائے' خواہ یہ چیز مشرکین کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے۔

جو شخص قرآن کی اس حقیقتِ کبریٰ پر ایمان رکھتا ہو کہئے کہ جب وہ دیکھے کہ عین اس زمانہ میں خود اسلام کے نام لیواؤں کی طرف سے یہ نظریہ پیش ہو رہا ہے کہ ''تمام مذاہب یکساں ہیں'' تو وہ کس طرح اس عقیدہ کو مبنی علی الحقیقت اور اس کی اشاعت کو خدمتِ اسلام قرار دے لے؟

پھر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر تم یہ دعویٰ کرو گے کہ ہمارا مذہب تمام مذاہب سے ارفع و اعلیٰ ہے اور نجات و سعادت اس سے باہر اور کہیں نہیں' تو اسی قسم کا دعویٰ دوسرے اہل مذاہب بھی کرنے لگ جائیں گے اور پھر وہی تقابل و توازن کا سوال پیدا ہو جائے گا۔ سو اول تو اب مقابلہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ دن گئے جب نظری مسائل کی بنا پر مباحثات و مناظرات کی بزم آرائیاں ہوا کرتی تھیں۔ اب تو حالت یہ ہے کہ ساری دنیا اپنے اپنے نظریات زندگی سے تنگ آ چکی ہے اور انہیں تلاش ہے کہ کہیں سے ایسا نظریۂ حیات مل جائے جس کے ماتحت انسان امن و سلامتی کی زندگی بسر کر سکے۔ جن اقوام نے قومیت کو امن و سکون کا ضامن بتایا تھا' وہ اب محض

دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

کے مطابق طوعاً و کرہاً نباہ کر رہے ہیں۔ ان حالات میں تقابل کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اب تو صرف صحیح اسلام کو اجاگر کرنے کی دیر ہے تشنہ لب دنیا خود بخود اس چشمۂ حیات کے گرد جمع ہو جائے گی۔ لیکن اگر مقابلہ کے سوال کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی مقابلہ سے گھبراتا کون ہے؟ عمرؓ کے لئے تو یہ چیلنج نوید مسرت ہے کہ اس کے اور زیدؓ کے بیٹے کو مقابلہ کے امتحان میں بٹھا دیا جائے۔ اگر دنیا پوچھنا چاہتی ہے تو بڑی خوشی سے پوچھ لے۔ ہم بتائیں گے کہ ان کے نظریات زندگی کہاں کہاں اور کیوں ناکام رہے اور ان کے مقابلہ میں اسلام کون سا ضابطۂ زندگی پیش کرتا ہے جو ان تمام اسقام و عیوب سے پاک ہے۔ لیکن اس وقت میرا تخاطب غیر مذاہب والوں سے نہیں۔ اس وقت میں صرف انہیں مخاطب کرنا چاہتا ہوں جو مسلمان کہلانے کے باوجود یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ تمام مذاہب یکساں ہیں۔ اس تخصیصِ تخاطب سے مقصد یہ ہے کہ ہم اس نظریہ کو قرآن کریم کی روشنی میں پرکھیں گے۔ غیر مذاہب والوں سے بات کرنے میں طریقِ استدلال اس سے مختلف ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک قرآن حجت نہیں ہوتا۔ لہٰذا میرا تخاطب ان سے ہے جو قرآن کو حجت مانتے ہیں۔ لہٰذا اگر قرآن کریم سے یہ ثابت ہو جائے کہ شرفِ انسانی کی تکمیل' حال اور مستقبل کی سرفرازی و سربلندی' ہر قسم کی فلاح و بہبود اور نجات و سعادت صرف اس نہجِ زندگی (دین) سے حاصل ہو سکتی ہے جس کا ترجمان قرآن کریم اور اس کے عملی پیکر محمد رسول اللہ ﷺ ہیں تو دنیا اسے کتنی ہی تنگ نظری پر کیوں نہ محمول کرے آپ کو (دوسروں کے پیمانوں کے مطابق) نگاہ کی ہزار وسعتیں اور قلب کی لاکھ کشادگیاں ''اس تنگ نظری'' پر قربان کر دینی چاہئیں۔ اگر آپ اس کے لئے تیار ہیں تو دامنِ خداوندی کے سایۂ رحمت میں آپ کے لئے جگہ ہے۔ اور اگر آپ اسے (معاذ اللہ) فی الواقع تنگ نظری اور کوتاہ ظرفی خیال کرتے ہیں تو اپنی نگاہ کی وسعتوں کے لئے ایسا آسمان تلاش کر لیجئے جہاں چھوٹے کو چھوٹا کہنا تنگ نظری قرار پائے۔ جہاں ناقص کو ناقص کہنا رواداری کے خلاف سمجھا جائے۔ جہاں سچے سے اس لئے اجتناب کیا جائے کہ اس سے جھوٹے کی دل شکنی ہوتی ہے۔ جہاں حقائق کو اس لئے چھپایا جائے کہ ان کے بے نقاب ہو جانے سے مصنوعی نگوں کے چہرے کا رنگ فق ہو جانے کا ڈر ہے اسلام میں تو حق کو حق اور باطل کو باطل کہنا ہی پڑے گا **ولو کرہ المشرکون**۔ جب یہ حقیقتِ ثابتہ ہے کہ آج اس

آسمان کے نیچے خدا کی طرف سے بھیجا ہوا پیغام اپنی اصلی اور مکمل شکل میں قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں تو اس حقیقت کے اعلان سے اس لئے ہچکچاہٹ پیدا ہونا کہ اس سے دوسرے تنگ نظری کا طعنہ دیں گے، اگر خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو راضی رکھنے کا عملی شرک نہیں تو اور کیا ہے؟

ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والھدی من بعد ما بینہ للناس فی الکتاب۔ اولئک یلعنھم اللہ ویلعنھم اللعنون ٥(٢/١٥٩)۔

جو لوگ ان باتوں کو چھپا لیتے ہیں جو ہم نے سچائی کی روشنی اور ہدایت سے نازل کی ہیں، باوجودیکہ ہم نے لوگوں کے لئے انہیں کتاب میں کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنتیں بھی ان کی حصے میں آئی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

جناب آزاد کی محولہ صدر تفسیر تقریباً پونے دو صد صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، جس کے اخیر میں انہوں نے ان طولانی مباحث کو چند صفحات میں سمٹا دیا ہے۔ یہی وہ خلاصۂ بحث ہے جس سے پنڈت سندر لال جی نے اپنے دعوے کے اثبات میں اقتباسات پیش کئے ہیں۔ قارئین کی سہولت کے لئے ان مقامات کو درج ذیل کیا جاتا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

لیکن قرآن نے نوعِ انسانی کے سامنے مذہب کی عالمگیر سچائی کا اصول پیش کیا۔

(الف) اس نے نہ صرف یہی بتلایا کہ ہر مذہب میں سچائی ہے بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ اس نے کہا دین، خدا کی عام بخشش ہے اس لئے ممکن نہیں کہ کسی ایک قوم اور جماعت کو دیا گیا ہو اور دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔

(د) اس نے بتلایا کہ ایک چیز دین ہے۔ ایک شرع ومنہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے اور ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے البتہ شرع ومنہاج میں اختلاف ہوا اور یہ اختلاف ناگزیر تھا۔ کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام واعمال اس کے لئے اختیار کئے جائیں۔ پس شرع ومنہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہوسکتا۔ تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے محض شرع ومنہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو۔

(ھ) اس نے بتلایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں اور ان کے ظواہر ورسوم کو انسانی نجات وسعادت میں کوئی دخل نہیں۔ یہ گروہ بندیاں تمہاری بنائی ہوئی ہیں ورنہ خدا کا ٹھہرایا ہوا دین تو ایک ہی ہے وہ دین حقیقی کیا ہے؟ وہ کہتا ہے ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ جو انسان بھی ایمان اور نیک عملی کی راہ اختیار کرے گا اس کے لئے نجات ہے خواہ وہ تمہاری گروہ بندیوں میں داخل ہو یا نہ ہو۔

(و) اس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام مذاہب اپنی مشترک اور متفقہ سچائی پر جمع ہو جائیں۔ وہ کہتا ہے تمام مذاہب سچے ہیں۔ لیکن پیروانِ مذاہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سرِنو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گیا اور انہوں نے مجھے قبول کر لیا۔ تمام مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ سچائی ہے جسے وہ **الدین** اور **الاسلام** کے نام سے پکارتا ہے۔ (ترجمان القرآن جلد نمبر اص ١٦٢-١٦٣)۔

دوسرے مقام پر شرع ومنہاج کے اختلاف کے ذیل میں لکھتے

ہیں:

لیکن قرآن کہتا ہے کہ نہیں یہ اعمال و رسوم نہ تو دین کی اصل حقیقت ہیں نہ ان کا اختلاف حق و باطل کا اختلاف ہے یہ محض مذہب کی عملی زندگی کا ظاہری ڈھانچہ ہے۔ لیکن روح وحقیقت ان سے بالاتر ہے اور وہی اصل دین ہے۔ یہ اصل دین کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ کی میراث نہیں ہے کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ **یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔** (ص ۱۲۷)۔

متعدد دیگر مقامات پر بھی انہی خیالات کو دہرایا گیا ہے۔ (بہتر ہو کہ تفسیر مذکور کا آپ خود مطالعہ کریں اور سیاق وسباق کو ملا کر ملاحظہ کر لیں کہ جناب آزاد کا نظریہ کیا ہے) اس کے بعد یہ دیکھئے کہ قرآن کریم کی رو سے نجات وسعادت کے لئے صرف خدا پرستی (اللہ کو مان لینے) اور ''نیک عملی'' ہی کی ضرورت ہے یا ان کے ساتھ رسالتِ محمدیہؐ پر بھی ایمان کی ضرورت ہے (جس کے ساتھ ہی قرآن کریم پر ایمان بھی لازم آجاتا ہے اور رسالت نبی اکرمؐ اور قرآن پر ایمان کے معنی ہی یہ ہیں کہ شریعت قرآنی کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ اسی کا نام ''نیک عملی'' ہے) یعنی ساری بحث کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ ایمان بالرسالت یعنی قرآنی شریعت کی اتباع بھی ضروری ہے یا نہیں۔ قرآن کریم میں کفار ومشرکین کے علاوہ اہل کتاب کا بھی ذکر آیا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اللہ پر ایمان رکھنے کے علاوہ نبی اکرم سے پیشتر کسی نہ کسی رسول اور قرآن سے پہلے کسی نہ کسی کتاب پر ایمان رکھتے تھے۔ لہٰذا اگر بحث کو اور مختصر کر دیا جائے تو وہ اس نقطہ میں سمٹ کر آجائے گی کہ کیا قرآن کریم کی رو سے اہل کتاب کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ رسالتِ محمدیہؐ اور اتباع قرآن پر بھی ایمان لائیں۔ یا اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر پختگی سے عمل پیرا ہو جائیں۔ اگر قرآن کریم اہل کتاب سے بھی رسالتِ محمدیہؐ اور اتباع قرآن کا مطالبہ کرتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اس کے سوا نجات وسعادت کی کوئی راہ اور نہیں تو بات صاف ہو جائے گی۔ اس لئے کہ جب اہلِ کتاب سے بھی ان چیزوں کا مطالبہ ہو تو غیر اہل کتاب سے یہ مطالبہ اور بھی شدید ہو جائے گا۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ قرآنِ کریم جس چیز کو دین یا اسلام کے نام سے پیش کرتا ہے اس کا مفہوم کیا ہے؟ قرآنی تعلیم کا اس باب میں مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی رشد وہدایت کے لئے مختلف زمانوں میں، مختلف اقوام وملل میں، حضراتِ انبیاءِ کرامؑ کی وساطت سے پیغامات آتے رہے۔ ان پیغامات کی اصل و بنیاد ہمیشہ ایک رہی۔ یعنی خدائے واحد کی عبودیت۔ اس کے سوا کسی اور کو اس قابل نہ سمجھنا کہ اس کے حکم کی اطاعت کی جائے۔ لیکن اس اصل کو بروئے کار لانے کے لئے عملی نظام کی تشکیل میں، مقتضیاتِ زمانہ کے اعتبار سے اختلاف ہوتا رہا۔ یہ پیغامات آتے۔ کچھ عرصہ تک اپنی شکل میں قائم رہتے۔ اس کے بعد یا تو آفاتِ ارضی وسماوی کے ہاتھوں ضائع ہو جاتے یا خود انسانوں کی دستبرد سے ان میں تحریف والحاق ہو جاتا۔ کہیں یہ فراموش ہی کر دیئے جاتے۔ لہٰذا کچھ وقت کے بعد ان پیغامات کی پھر سے تجدید ہو جاتی۔ انہی جیسے پیغامات (آیات اللہ) کا پھر نزول ہو جاتا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور حقیقت بھی تھی۔ یعنی

انسانیت خود اپنی ارتقائی منازل طے کر رہی تھی۔ اس کے مقتضیات اور ضروریات میں بھی اضافہ ہوتا جاتا تھا اس لئے ہر زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مطابق نظام خداوندی کی تشکیل کے عناصر میں بھی ارتقائی اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ یعنی ہر رسول کے وقت کچھ تو گذشتہ رسول کے فراموش کردہ یا ضائع شدہ پیغامات (سچائیوں) کی تجدید ہو جاتی تھی اور کچھ ان پر اضافہ بھی ہو جاتا تھا اور ترمیم و تنسیخ بھی۔ لیکن یہ ترمیم و تنسیخ ہمیشہ ارتقاء و عروج کی طرف لے جاتی تھی۔ تنزل و ہبوط کی طرف نہیں جاتی تھی۔ ذیل کی آیت مقدسہ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ فرمایا:

ما ننسخ من ایۃٍ اوننسھانات بخیر منھا اومثلھا(۲/۱۰۱)۔

(ہمارا قانون یہ ہے کہ) ہم اپنے احکام میں سے جو کچھ منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش ہو جانے دیتے ہیں تو اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا حکم نازل کر دیتے ہیں۔

یعنی منسوخ شدہ حکم (آیت) کی جگہ اس سے بہتر اور فراموش شدہ حکم (آیت) کی جگہ اس جیسا حکم آ جاتا تھا۔ چنانچہ قرآن میں کتبِ سابقہ میں الحاق و تحریف کی تصریحات متعدد مقامات پر مذکور ہیں **ولقد اتینا موسی الکتاب فاختلف فیہ** (ہم نے موسیٰ کو کتاب دی۔ سو اس میں اختلافات ڈالے گئے) **یحرفون الکلم عن مواضعہ ونسواحظا مما ذکر وابہ** (وہ کلمات کو ان کی جگہ سے پھیر دیتے ہیں اور جو کچھ انہیں یاد دلایا گیا تھا اس میں سے ایک حصہ انہوں نے بھلا ہی دیا) **فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ** (افسوس ہے ان پر جو کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے)۔

اس قسم کے متعدد مقامات میں تحریف، الحاق، فراموشی، دانستہ تغیر و تبدل کی تصریحات موجود ہیں اور پھر اس حقیقتِ باہرہ پر خود ایک دنیا شاہد ہے۔ آج دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں جو اس دعوے کو بدلائل ثابت کر سکے کہ جس کتاب کو وہ صحیفۂ آسمانی سمجھتے ہیں وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو ان کے پیغمبر پر نازل ہوئی تھی۔ اس کے برعکس اس امر کے لئے بے شمار تاریخی شہادات موجود ہیں کہ ان کتابوں کے اصل نسخوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بہرحال یہ سلسلۂ رشد و ہدایت یونہی جاری رہا۔ تا آنکہ دنیا اپنے عہدِ طفولیت سے نکل کر سنِ رشد و بلوغ کو پہنچ گئی۔ اب مشیتِ ایزدی کے اندازے کے مطابق وہ وقت آ گیا کہ ان تمام حقائق کو جو اس سے پیشتر حضراتِ انبیاء کرامؑ کی وساطت سے دنیا میں بھیجے گئے تھے اور جو یا تو بالکل ضائع ہو چکے تھے یا ان میں تحریف و الحاق ہو چکا تھا، ان کی اصلی شکل میں ایک جگہ جمع کیا جائے۔ پھر ان تمام احکامات کی جگہ جو وقتی طور پر آئے تھے ایسے احکامات بدل دیئے جائیں جو قیامت تک کے لئے انسانی ضروریات کے لئے مکتفی ہوں۔ اس طرح ان تمام حقائق و اصولات کو یکجا اکٹھا کر کے اسے محفوظ طریقے پر دنیا کو دیا گیا اور اسے قیامت تک کے لئے محفوظ رکھنے کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا۔ اس مجموعۂ حقائق، ضابطۂ خداوندی کی اس (Latest) اور آخری ایڈیشن کا نام قرآنِ کریم ہے۔ اب ساری دنیا میں اعلان کر دیا گیا کہ ہماری نعمتیں

مکمل ہوگئیں۔ ضابطۂ حیاتِ انسانی کو آخری ترتیب دے دی گئی۔ تمام سابقہ سچائیاں اس کے اندر آ گئیں۔ اب نجات و سعادت کے لئے صرف یہی ضابطہ قولِ فیصل ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ جہاں ہے ساقط العمل ہے۔ اب دین ہے تو یہی۔ اسلام ہے تو اسی کا نام۔ ایمان ہے تو اس پر۔ اس کے باہر نہ کہیں دین ہے نہ اسلام نہ شریعت ہے نہ منہاج۔ یہ اس خدا کا اعلان ہے جس نے ان پیغامات کو بھیجا جو اس سے پہلے نافذ العمل تھے۔ اسی نے ایک کی جگہ دوسرے کو بھیجا۔ اسی نے ان تمام کو سمٹا کر اس ایک میں جمع کر دیا اور ان تمام کی جگہ اب صرف اسی ایک کو اپنا ضابطۂ قوانین قرار دیا۔ اسی نے اس بات کا حکم دیا کہ اس حقیقت پر ایمان لاؤ کہ اس سے پیشتر جتنے انبیاء کرامؑ تشریف لائے وہ اللہ کی طرف سے مبعوث ہوئے تھے۔ جو پیغامات انہوں نے دیئے وہ بھی خدا کی طرف سے نازل شدہ تھے۔ نہ نبی ہونے کی حیثیت سے ان حضرات انبیاء کرامؑ میں کوئی فرق ہے نہ پیغاماتِ خداوندی ہونے کی جہت سے ان پیغامات میں کوئی اختلاف۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی اسی خدا نے فرما دیا کہ اب اتباع و اطاعت صرف اس مجموعۂ قوانین کی ہوگی جس کا نام قرآن کریم ہے۔ یہ ہے الدین اور یہ ہے الاسلام۔ اسی کا ہر انسان سے مطالبہ ہے اور اسی سے نجات و سعادت وابستہ۔ یہ کہنا درست ہے کہ سچائیاں اپنے اپنے وقت میں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود تھیں۔ لیکن یہ کہنا سراسر خلافِ حقیقت اور خلافِ قرآن ہے کہ ''اصل دین ہر مذہب میں یکساں موجود ہے''۔ (ترجمان القرآن جلد ۱، صفحہ ۱۳۷)۔

''موجود تھیں'' اور ''موجود ہے''۔ میں زمین اور آسمان کا فرق ہے اور یہی فرق ہے جس پر اس جدید نظریہ کے حق و باطل ہونے کا انحصار ہے۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے سے سارا معاملہ حل ہو جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔ قرآن کا بنیادی مطالبہ ایمان کا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایمان سے مراد صرف ایمان باللہ (خداپرستی) ہی ہے یا اس سے زیادہ کچھ اور بھی۔ سارا قرآن ایمان ہی کی تفسیر ہے جس کے اس نے پانچ اجزاء بتائے ہیں:

ولکن البر من امن باللہ والیوم الاخر والملئکتہ والکتب والنبیینo(۲/۱۷۷)۔

بلکہ نیکی اس کی ہے جو اللہ آخرت کے دن ملائکہ کتب اور انبیاء پر ایمان لائے۔

انہی اجزائے ایمانیہ کا انکار کفر اور صریح گمراہی ہے۔

ومن یکفر باللہ و ملائکتہ و کتبہ ورسلہ والیوم الاخر فقد ضل ضلالا بعیدا(۴/۱۳۵)۔

اور اللہ اس کے ملائکہ۔ اس کی کتب و رسل اور یومِ آخر سے انکار کرے تو وہ بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا۔

لیکن قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ بعض مقامات پر تو ان اجزاء کو بالتفصیل بیان کرتا ہے اور دیگر مقامات پر اس تفصیل کی بجائے اجزائے ایمانیہ کا اجمالی تذکرہ کر دیتا ہے اور سیاق و سباق اور نفسِ موضوع کے اعتبار سے جس جزو پر زور دینے کی ضرورت ہوتی ہے صرف اسی کو بیان کرتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ صرف اللہ پر ایمان کا ذکر ہے۔

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل

علیھم الملائکۃ(۴۱/۲۹)۔

یقیناً جن لوگوں نے اقرار کرلیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ثابت قدم رہے تو ان پر فرشتے نازل ہوں گے۔

متعدد مقامات پر صرف اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان ہی کا ذکر ہے۔

من امن باللہ والیوم الاخر و عمل صالحا فلھم اجرھم عند ربھم۔(۲/۶۲)۔

جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لے آیا اور اس نے عمل صالح کئے تو ان کا اجر ان کے اللہ کے ہاں ملے گا۔

کہیں خدا اور رسولوں پر ایمان کا ذکر ہے۔ **فامنوا باللہ ورسلہ** (۳/۱۷۸)۔ (پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔) کہیں ان کے ساتھ ایمان بالکتاب کا بھی ذکر ہے۔ **فامنوا باللہ ورسولہ والنور الذی انزلنا** ۔ (پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا)۔

غرضیکہ مختلف مقامات پر مختلف اجزائے ایمان کا ذکر آتا ہے لیکن اس سے یہ مقصود نہیں کہ ایمان کے اجزاء ایک دوسرے سے الگ کئے جا سکتے ہیں اور صرف ایک یا دو اجزاء پر ایمان لے آنا مومن ہونے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ مطالبہ تمام اجزائے ایمانیہ کا مشترک ہے ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ یہ شق اول ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

اب شق دوم کی طرف آیئے۔ سوال یہ ہے کہ اللہ۔ رسل، کتب پر ایمان لانے سے مفہوم کیا ہے؟ قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان سے مقصود اطاعت ہے۔ اللہ پر ایمان لانے سے مفہوم یہ ہے کہ اس کے احکامات کی اتباع کی جائے (اطیعوا اللہ) محض اللہ کی ہستی کا اقرار کر لینا ایمان نہیں کہلا سکتا۔ دنیا میں چند دہریوں کے سوا کون ہے جو اللہ کی ہستی کا قائل نہیں۔ نام میں اختلاف ہوگا، تصور میں اختلاف ہوگا۔ تعینِ صفات میں اختلاف ہوگا لیکن اس کی ذات کا اقرار تو ہر جگہ ملے گا۔ سو اگر ایمان سے مراد فقط اللہ کی ذات کا اقرار ہوتا تو قرآن کریم ان لوگوں کو کافر کیوں کہتا جو خدا کی ہستی کا اقرار کرتے تھے۔ قرآن کریم میں کئی ایک مقامات پر اس کی تصریح موجود ہے کہ جب ان لوگوں سے پوچھو کہ زمین و آسمان کا خالق کون ہے؟ بارش کون برساتا ہے؟ ہوائیں کون چلاتا ہے؟ تو یہ جواب میں کہیں گے کہ اللہ! لیکن اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ حیرت ہے کہ اس اقرار کے باوجود یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایمان کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔ ذات باری تعالیٰ کا ان تمام تفصیلات کے ساتھ اقرار جو قرآن میں مذکور ہیں اور اس کے ساتھ اس کے احکامات کی اطاعت۔ یہ ہے ایمان باللہ کا قرآنی مفہوم۔ چونکہ خدا کے احکام حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے ملتے ہیں اور خدا کی وحی میں محفوظ ہوتے ہیں اس لئے اللہ پر ایمان کے ساتھ، اس کے انبیاء اور کتب پر ایمان کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ اس سے بھی یہی مفہوم ہے کہ احکاماتِ خداوندی کی اطاعت کی جائے۔ خود قرآن کریم کے متعلق فرمایا:

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء

جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اس کی

پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے اولیاء کی پیروی مت کرو۔

دین کا مدار ہی اطاعت پر ہے۔ خالص اور بے لوث خدا کی اطاعت۔ قرآن سے پیشتر کی کتابوں کی اطاعت اپنے اپنے وقت میں تھی وہ کتابیں ضائع ہوگئیں۔ محرف ہوگئیں یا ساقط العمل قرار پا گئیں۔ لہٰذا ان کی اطاعت بھی ختم ہوگئی۔ اور جب کتاب ہی اپنی اصلی شکل میں نافذ العمل نہ رہی تو اس کے لانے والے رسول کی رسالت کا زمانہ بھی ختم ہوگیا۔ ان سب کے بعد نبی آخرالزماں تشریف لائے۔ جن پر نازل شدہ کتاب (قرآن کریم) اپنی اصلی شکل میں قیامت تک کے لئے نافذ العمل ہے۔ اس لئے اب اللہ اور اس کے رسول پر ایمان (یعنی اطاعت) قرآنِ کریم کی اتباع میں مضمر ہے۔ اب نبی اکرمؐ سے پیشتر رسولوں اور قرآن کریم سے پہلے کی کتابوں پر ایمان سے مفہوم یہ رہ گیا کہ وہ اپنے اپنے وقت میں اللہ کے سچے پیغامبر اور ان کے پیغامات خدا کے سچے احکام تھے۔ اب وہ تمام احکام قرآن کریم کے اندر آ چکے ہیں۔

وانزلنا الیک الکتاب بالحق مصدقالما بین یدیه من الکتاب ومهیمنا علیه۔

اور ہم نے تجھ پر حق کے ساتھ کتاب اتاری جو پہلی کتابوں (کے دعاویٰ کو) سچا کر کے دکھانے والی اور ان (سچائیوں) کی محافظ ہے۔

اس لئے ایک نئی کتاب آ جانے کے بعد پرانی کتاب کی اطاعت کچھ معنی نہیں رکھتی۔ ضابطۂ قوانین کا ہر نیا ایڈیشن پہلے ایڈیشن کو منسوخ کر دیتا ہے۔ اس نئے ایڈیشن میں جدید اضافوں کے علاوہ سابقہ ایڈیشن کی وہ تمام چیزیں بھی آ جاتی ہیں جن کا نافذ العمل رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا زندہ قانون اسی آخری ایڈیشن کا سمجھا جاتا ہے۔ بنابریں قرآن کریم کے بعد مختلف اہل مذاہب (یا اہل کتاب) کا اپنے اپنے ہاں کی سچائیوں (یعنی اپنے اپنے مذہب کی کتابوں) پر کاربند ہو کر زندگی بسر کرنا اصولاً غلط ہے۔ اب ''سچائیاں'' (ان کے ہاں کی اور ان کے علاوہ تمام جن کی نوعِ انسانی کو ضرورت ہے) صرف قرآن کریم کے اندر ہیں۔ چونکہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ ہر نئے رسول اور ہر نئی کتاب کے آنے پر اسی رسول اور اسی کتاب کی اتباع ضروری ہو جاتی تھی۔ اس لئے ہر رسول سے یہ کہہ دیا جاتا تھا کہ اپنی امت سے کہہ دیں کہ جب رشد و ہدایت آسمانی کے اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی آ جائے' جس کے بعد کوئی اور رسول اور کوئی اور کتاب نہ آئے گی تو تم سب کو اس آخری کڑی کی اتباع کرنی ہوگی۔ سورۂ اعراف کے انیسویں رکوع میں دیکھئے۔ حضرت موسیٰؑ دعا مانگتے ہیں کہ بارالٰہا! تو نے اس قوم (بنی اسرائیل) پر اپنی نوازشات کو یوں عام کیا ہے تو اس سلسلہ کو اسی طرح جاری رکھیو۔ ارشاد ہوا کہ بے شک ہماری رحمتیں بے پایاں اور ہر شے پر چھائی ہوئی ہیں لیکن ہمارے نظامِ رشد و ہدایت کے مطابق یہ صرف ان کے حصہ میں آ سکیں گی جو ہمارے آخری نبی اور آخری کتاب پر ایمان لائیں گے۔ یعنی ان کی اتباع کریں گے۔

فسا کتبها للذین یتقون ویؤتون الزکوٰة والذین هم بایاتنا یومنون o الذین یتبعون الرسول النبی الا می الذی یجدونه مکتوبا عندهم فی التوراة والانجیل یامرهم بالمعروف وینههم عن المنکر ویحل لهم الطیبٰت ویحرم علیهم الخبائث ویضع عنهم

اصرھم والاغلٰل التی کانت علیھم فالذین امنوا بہٖ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہٗ اولٓئک ھم المفلحون o
(۷/۱۵۶-۵۷)۔

وہ رحمت میں ان لوگوں کے لئے لکھ دوں گا جو خدا کی حفاظت میں رہیں گے۔ زکوٰۃ دیں گے اور ہماری آیات (احکام) پر ایمان لائیں گے۔ یعنی وہ لوگ جو اس نبی امی کا اتباع کریں گے جسے وہ توراۃ وانجیل میں لکھا ہوا پائیں گے۔ وہ انہیں نیک باتوں کا حکم دے گا۔ بری باتوں سے منع کرے گا۔ پاکیزہ چیزیں ان کے لئے حلال کرے گا' ناپاک چیزیں حرام کرے گا اور وہ طوق وسلاسل جو ان پر پڑے ہوئے ہوں گے ان کو ان سے الگ کرے گا۔ جو لوگ اس نبی پر ایمان لائیں گے اور اس کی عزت کریں گے اور اس کی مدد کریں گے اور اس نور کا اتباع کریں گے جو اس کے ساتھ نازل کیا جائے گا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے۔

غور کیجئے کہ فلاح وسعادت کے لئے قرآن کریم نے کیا شرط لازم قرار دی ہے۔ نبی اکرم ﷺ پر ایمان اور قرآن کریم کی اتباع۔ اسی کا نام اسلام ہے۔ یہاں صرف حضرت موسیٰؑ کے متعلق ارشاد ہے۔ دوسرے مقام پر تمام انبیاء کرامؑ کے متعلق بھی ایسا ہی فرمایا ہے:

واذ اخذاللہ میثاق النبیین لما اتیتکم من کتاب وحکمۃ ثم جاء کم رسول مصدق لما معکم لتؤمنن بہ ولتنصرنہ۔ قال ءاقررتم واخذتم علی ذٰلکم اصری۔ قالوا اقررنا۔ قال فاشھدوا وانا معکم من الشھدین o فمن تولی بعد ذلک فاولئک ھم الفسقون o افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم من فی السموات والارض طوعاً و کرھا والیہ یرجعون o قل امنا باللہ وما انزل علینا وما انزل علی ابراھیم واسمعیل واسحق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسی و عیسی والنبیون من ربھم لا نفرق بین احدمنھم ونحن لہ مسلمون o ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الاخرۃ من الخسرین o(۳/۸۰-۸۴)۔

جب اللہ نے انبیاء سے عہد لیا تھا کہ ہم نے تمہیں کتاب وحکمت عطا فرمائی ہے۔ پھر جب تمہارے پاس وہ رسول آئے جو مصدق ہو اس کا جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اس پر ایمان لانا۔ اور اس کی تائید کرنا۔ فرمایا کیا تم نے اقرار کیا؟ اور اس پر میرا عہد قبول کیا؟ انہوں نے کہا کہ بے شک ہم اقرار کرتے ہیں۔ اس پر اللہ نے کہا کہ اس پر گواہ رہنا اور دیکھو! تمہارے ساتھ میں بھی اس پر گواہ ہوں۔ تو اب جو کوئی اس عہد وقرار کے بعد اس سے روگردانی کرے گا تو یقیناً ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کا دین چھوڑ کر کوئی دوسری راہ ڈھونڈھ نکالیں؟ حالانکہ آسمان وزمین میں جو کوئی بھی ہے طوعاً وکرہاً سب اللہ کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں اور بالآخر سب اسی طرف لوٹنے والے ہیں۔

اے رسول تم کہہ دو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور اس پر جو ابراہیمؑ واسمٰعیلؑ واسحٰقؑ ویعقوبؑ اور یعقوبؑ کی اولاد پر نازل ہوا ہے اور اس پر بھی جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور تمام انبیاء کو دیا گیا ان کے رب کی طرف سے۔ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم خدا کے فرمانبردار ہیں۔

تو دیکھو جو کوئی اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کی طلب کرے گا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں اس کی جگہ ان لوگوں میں ہوگی جو تباہ ونامراد ہوں گے۔

انبیاء سے عہد لینے سے مطلب یہ ہے کہ ان کی وساطت سے ان کی امتوں سے عہد لیا گیا تھا۔ چنانچہ کتبِ سماوی کے جو بچے کھچے حصے کہیں آج بھی موجود ہیں ان میں اس امر کی طرف

اشارات ملتے ہیں کہ وہ انبیاءؑ رشد و ہدایت کے اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی (یعنی نبی آخرالزماں) پر ایمان لانے کی تلقین کیا کرتے تھے کہ یہی اس نظام خداوندی کا تقاضا تھا۔ لہٰذا نبی اکرمؐ کے تشریف لے آنے کے بعد حضورؐ پر ایمان کے بغیر نجات وسعادت کی کوئی راہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم تفریق بین الرسل (رسولوں میں ایک دوسروں میں فرق کرنے) کو پکا کفر قرار دیتا ہے۔ (۴/۱۵۰)۔

شق دوم سے ظاہر ہے کہ:

(۱) رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانے سے مفہوم صرف انہیں مان لینا نہیں بلکہ ان کی اطاعت کرنا ہے۔

(۲) تفریق بین الرسل کفر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام رسول اپنے اپنے وقت میں اللہ کی طرف سے پیغامِ رشد و ہدایت لاتے رہے اور اپنے اپنے وقت میں ان کی اطاعت فرض تھی۔

(۳) نبی اکرمؐ پر ایمان لانے کے بھی یہی معنیٰ ہیں کہ قرآن کی اطاعت کی جائے۔ اور چونکہ حضورﷺ کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا اس لئے قرآن کی اطاعت قیامت تک کے لئے ہے اور تمام نوعِ انسانی کے لئے ہے۔

(۴) اب جو کوئی خدا، اس کے رسولوں اور کتابوں پر اس طرح ایمان لائے گا جس طرح نبی اکرمﷺ نے بتایا تو وہی ہدایت پر سمجھا جائے گا۔

فان امنوا بمثل ما امنتم به فقد اهتدوا۔ وان تولوا فانما هم فی شقاق (۲/۱۳۷)۔

پس اگر یہ لوگ اس پر اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو پھر یہ لوگ راہِ ہدایت پر ہوں گے اور اگر یہ اس سے پھر جائیں گے تو پھر یہ مخالفت کی راہ ہوگی۔

کہا یہ جاتا ہے کہ جو لوگ تمام مذاہب کو یکساں قرار دیتے ہیں وہ محمدؐ رسول اللہ کی سچائی کا بھی اقرار کرتے ہیں۔ اس لئے یہ تفریق بین الرسل نہیں۔ یعنی وہ حضورﷺ کو بھی خدا کا سچا رسول مانتے ہیں۔ چنانچہ خود جناب آزاد نے بھی اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کے لئے خدا کی توحید کے ساتھ حضورﷺ کے درجۂ رسالت وعبودیت کا اقرار بھی ضروری ہے صفحہ ۱۱۹، یعنی جناب آزاد کے نزدیک

(۱) دوسرے انبیاء کرام کی طرح نبی اکرمؐ پر ایمان تو ضروری ہے لیکن

(۲) نجات وسعادت کے لئے اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر کاربند ہونا ہی کافی ہے۔

یعنی ان کے نزدیک صورتِ حال یوں ہوئی کہ جس طرح مسلمان حضرت موسیٰؑ و دیگر انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ منجانب اللہ تھے لیکن اتباع صرف اس کتاب کی کرتے ہیں جو محمدؐ رسول اللہ کو ملی تھی۔ اسی طرح اگر عیسائی اور موسائی حضرت محمد رسول اللہﷺ کو منجانب اللہ سمجھ لیں لیکن اتباع اپنے ہی مذہب کی کرتے رہیں تو اسلام کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اس غلط فہمی کی بنیاد اس اصل پر ہے کہ ان حضرات کے نزدیک محمد رسول اللہﷺ پر ایمان سے مفہوم فقط اتنا ہے کہ آپ کے متعلق یہ اقرار کر لیا جائے کہ آپ منجانب اللہ رسول تھے اور بس۔ حالانکہ شق دوم میں قرآن کریم کی نصوصِ صریحہ سے واضح کیا جا چکا ہے کہ جب انبیائے سابقہ (علیہم السلام) اور نبی اکرمﷺ (یا کتب سابقہ اور قرآن کریم) کے متعلق

ایمان کا لفظ بولا جائے گا تو اس کے قرآنی مفہوم میں ایک بنیادی فرق ہوگا۔یعنی ایک نئے نبی کے آنے کے بعد سابقہ نبی یا نئی کتاب کے نازل ہونے کے بعد پہلی کتاب پر ایمان کے معنی فقط اتنے ہوں گے کہ وہ نبی یا وہ کتاب اپنے وقت میں منجانب اللہ تھی اور اس نئے نبی اور نئی کتاب کے متعلق ایمان سے مفہوم یہ ہوگا کہ انہیں منجانب اللہ مانا جائے اور ان کی اطاعت بھی کی جائے جس طرح ایک جدید وائسرائے کے آنے کے بعد اس کے پیشرو کے متعلق فقط اتنا ماننا ضروری رہ جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت میں بادشاہ کا جانشین تھا۔لیکن اطاعت اس جدید وائسرائے کے ذریعے دیئے ہوئے احکام ہی کی لازم ہوگی۔لہٰذا جب مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ہم تمام انبیائے سابقہ پر ایمان لاتے ہیں تو اس سے مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہم اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ تمام حضرات علیہم السلام اپنے اپنے وقت میں اللہ کے پیغامات کے حامل اور باذن اللہ مطاع تھے۔لیکن نبی آخرالزماں ﷺ کی تشریف آوری کے بعد اطاعت فقط قرآن کریم کی باقی رہ گئی۔اس لئے کہ اس کے اندر تمام سابقہ کتب کی سچائیاں جمع کر دی گئی ہیں اور اس پر جدید احکامات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔لہٰذا تفریق بین الرسل سے صرف اتنا ہی مفہوم نہیں کہ اس امر کا زبانی اقرار کر لیا جائے کہ تمام انبیائے سابقہ (مع نبی اکرمؐ) منجانب اللہ رسول تھے بلکہ اس سے مفہوم یہ ہے کہ تمام انبیائے سابقہ کی رسالت کے اقرار کے ساتھ ساتھ اطاعت خدا کی آخری کتاب کی کی جائے۔اگر نبی اکرمؐ کی رسالت کا زبانی اقرار ہو اور اطاعت اپنے اپنے مذہب کی کی جائے تو یہ قرآنی ایمان نہیں ہے۔کفر ہے۔

یٰایھا الناس قد جاء کم الرسول بالحق من ربکم فامنوا خیرا لکم فان تکفروا فان للہ ما فی السموات والارض وکان اللہ علیما حکیما (۴/۱۷۰)۔

اے نوع انسانی! یقیناً تمہاری طرف اللہ کا رسول حق کے ساتھ آ گیا ہے۔سو اگر تم ایمان لے آؤ تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر تم کفر کرو تو (تمہارے کفر سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑے گا) جو کچھ زمین و آسمان میں ہے سب اللہ کے لئے ہے اور اللہ علیم وحکیم ہے۔

پھر ذرا اس پر بھی غور کیجئے کہ ایک شخص مانتا ہے کہ نبی اکرمؐ ایک راستباز اور حق گو انسان تھے۔وہ خدا کی طرف سے سچے رسول تھے لیکن اطاعت انہی امور کی کرتا ہے جو اس کے اسلاف سے اس کے پاس چلے آتے ہیں اور جن کی نسبت کسی سابقہ رسول کی طرف کی جاتی ہے تو سوچئے کہ اس کے اس زبانی اقرار و ایمان سے مفہوم کیا ہے؟ یعنی وہ مانتا ہے کہ خدا کی طرف سے حضور ﷺ پر قرآن کریم نازل ہوا۔اور اس قرآن میں یہ لکھا ہے کہ ہدایت وسعادت قرآن کے اتباع ہی سے حاصل ہوسکتی ہے لیکن وہ اتباع واطاعت کے لئے اور گوشے تلاش کرتا ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ وہ حضور ﷺ کو اللہ کا آخری رسول اور قرآن کو خدا کی کتاب نہیں مانتا۔اگر مانتا تو اس کی اطاعت کیوں نہ کرتا۔

جو لوگ اس قسم کی ''رواداری'' اور ''وسعت نظر'' کی باتیں کرتے ہیں وہ یا تو خود فریبی میں مبتلا ہیں یا فریب دہی میں اور جو مسلمان انہیں یہ یقین دلاتا ہے کہ از روئے قرآن اس بات کا بھی امکان ہے کہ رسولؐ اللہ کو خدا کا سچا رسول مانتے ہوئے پیروی کسی اور مذہب کی بھی کی جاسکتی ہے۔تو وہ

ان کے اس فریب پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ خود ہندوستان میں برہموسماجیوں کا فرقہ موجود ہے جن کے عقائد یہ ہیں :

(۱) خدائے واحد کی اور صرف اسی کی پرستش کی جائے۔ خدا کا کوئی اوتار نہ مانا جائے۔ بت پرستی کی مخالفت کی جائے۔

(۲) صحیفۂ فطرت کو مذہبی اعتقادات کا بنیادی اصول مانا جائے۔

(۳) اگرچہ اپنے مذہبی عقائد کی بنیاد کسی خاص کتاب پر نہ رکھی جائے لیکن ہر الہامی کتاب کی صداقت وحقانیت کو تسلیم کیا جائے۔

(۴) ہر مذہب کے سچے اصولوں کو اعتقادی اصول مانا جائے۔

(۵) ظواہر ورسوم پر اعتقاد نہ رکھا جائے بلکہ مقصد اصلی قلبی صفائی کو قرار دیا جائے۔

(ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا اور انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنس اینڈ ایتھکس)

''رواداری'' اور ''وسعتِ نظر'' کے تمام گوشے اس تعلیم کے اندر سمٹے ہوئے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس کے باوجود برہموسماجی حضرات ہندو کے ہندو ہیں۔ مجھے ان حضرات کی نیت پر شبہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک کسی الہامی کتاب کی ''حقانیت اور صداقت'' کے اقرار کے معنی فقط اتنے ہی ہیں کہ زبان سے اقرار کر لیا جائے کہ وہ سچی کتاب ہے۔ ان کے اس ایمان میں اطاعت شامل نہیں ہے۔ قرآنی نقطۂ خیال سے یہ حضرات ایک کھلی ہوئی غلطی پر ہیں مگر چونکہ ان کے سامنے قرآن کریم نہیں اس لئے ان کا یہ عقیدہ چنداں درخورِ اعتناء نہیں۔ لیکن جو شخص قرآن کریم کو اپنے سامنے رکھنے کا مدعی ہو اگر وہ بھی اس عقیدہ کا ہمنوا ہو جائے تو اس کے متعلق کیا کہا جائے؟ وہ قرآن جو کھلے کھلے الفاظ میں کہہ رہا ہے کہ

قل یایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعان الذی لہ ملک السموات والارض۔ لا الہ الا ھو یحی ویمیت فامنوا باللہ ورسولہ النبی الامی الذی یومن باللہ و کلمتہ واتبعوہ لعلکم تھتدون ○(۷/۱۵۸)

(اے رسول! ان سے کہہ دو کہ) اے نوعِ انسانی۔ میں تم تمام کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی مارتا اور وہی جلاتا ہے۔ پس ایمان لاؤ تم اللہ پر اور اس کے رسول نبی امی پر۔ جو خود اللہ پر اور اس کے کلام پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی اتباع کرو تا کہ تم ہدایت پا جاؤ۔

لہٰذا کوئی شخص رسول اکرم ﷺ کو خدا کا سچا رسول اور قرآن کریم کو خدا کی سچی کتاب ماننے کے دعوے میں سچا نہیں ہے تاوقتیکہ وہ قرآن کی اتباع نہ کرے اور یہ خطاب تمام نوعِ انسانی سے ہے۔ کسی خاص فرقہ یا گروہ سے نہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

اب شق سوم کی طرف آیئے یعنی کیا اتباع میں احکام کتاب کی اتباع بھی ضروری ہے یا محض اپنے اپنے انداز پر ''خدا پرستی اور نیک عملی'' ہی نجات و سعادت کے لئے کافی ہے۔ اس باب میں جناب آزاد کے نظریہ پر ایک دفعہ پھر نگاہ ڈال لیجئے۔ وہ لکھتے ہیں :

(د) اس نے بتلایا کہ ایک چیز دین ہے۔ ایک شرع ومنہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے اور ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے۔ البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا اور یہ اختلاف ناگزیر تھا کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام واعمال اس کے لئے اختیار کئے جائیں۔ پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو جا سکتے۔ تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے۔ محض شرع ومنہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو۔

(ھ) اس نے بتلایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں اور ان کے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں..... (ترجمان القرآن، جلد ۱، صفحہ ۱۶۳)۔

ان اقتباسات کے ساتھ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۷۲ کا حسب ذیل تشریحی نوٹ بھی قابل ملاحظہ ہے:

(۵) دین حق کی اس اصلِ عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات کی راہ یہ نہیں ہے کہ عبادت کی کوئی خاص شکل یا کھانے پینے کی کوئی خاص پابندی یا اسی طرح کی کوئی دوسری بات اختیار کر لی جائے۔ بلکہ وہ سچی خداپرستی اور نیک عملی کی زندگی سے حاصل ہوتی ہے۔ (ص ۲۲۹ تفصیل اصل کتاب میں دیکھئے)۔

یہی اقتباسات پنڈت سندر لال جی نے اپنے خطبۂ صدارت میں پیش کر کے یہ ثابت کیا تھا کہ چونکہ خداپرستی اور نیک عملی کی تلقین تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے اور یہی اصل دین ہے۔ اس لئے ایک ہندو جو اپنے طور و طریقہ پر اپنے مذہب کی شریعت کا پابند ہے، اسی طرح نجات و سعادت کا مستحق ہے جیسے ایک مسلمان، قرآنی شریعت کے اتباع سے نجات کا مستحق۔

قبل اس کے کہ ہم یہ دیکھیں کہ قرآن کی رو سے شرع و منہاج کو کتنی اہمیت حاصل ہے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جنابِ آزاد نے اپنے اس نظریہ کی رو سے اسلام کی جڑ پر ایسی ضربِ کاری لگائی ہے کہ اس نظریہ کے تسلیم کر لینے کے بعد یہ شجر مقدس پورے کا پورا اکھڑ کر باہر آ جاتا ہے۔ قرآن کی رو سے نبی اکرم ﷺ سے پہلے جتنے انبیاء کرامؑ تشریف لائے وہ ایک خاص قوم کی طرف مبعوث ہوئے اور ایک خاص وقت کے لئے ان کا پیغام نافذ العمل رہتا۔ یعنی ان کی رسالت کا دائرہ زمان و مکان کی حدود سے گھرا ہوا تھا۔ اس لئے ان کی وساطت سے جو احکامات نافذ ہوتے وہ اس خاص قوم کے حالات کے پیش نظر دیئے جاتے جن کی طرف وہ مبعوث ہوتے۔ نبی اکرم ﷺ کی تشریف آوری سے یہ نظام بالکل بدل گیا۔ حضورؐ کی بعثت کسی خاص قوم، ملک، قبیلہ، گروہ یا کسی خاص وقت کے لئے نہیں بلکہ آپ کا پیغام عالمگیر اور آپ کی مخاطب تمام نوع انسانی ہے۔ سارا قرآن اس حقیقتِ کبریٰ پر شاہد ہے۔ حضور ﷺ کی رسالت کا دائرہ زمان اور مکان کے حدود سے محصور نہیں۔ بلکہ دنیا کے ہر ملک میں، ہر زمانہ میں، قیامت تک کے آنے والے انسانوں کے لئے حضور ﷺ کی رسالت یکساں ہے اس لئے جو تشریعی احکام قرآن کریم میں مذکور ہیں وہ کسی خاص قوم کے خاص حالات کو سامنے رکھ کر وضع نہیں کئے گئے بلکہ وہ عالمگیر ہیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن کریم کے تشریعی احکام، نبی اکرمؐ کے زمانہ کے اہل عرب کے حالات و مقتضیات کے مطابق نافذ ہوئے تھے تو اسلام کی ''عالمگیریت'' کا دعویٰ خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اسلام کے احکامات نہ ہر زمانہ میں نافذ العمل ہو سکتے ہیں نہ ہر قوم پر ان کی پابندی لازم قرار دی جا سکتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم کے تشریعی احکام کے متعلق یہ کہنا کہ چونکہ

ہر عہد اور قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اس کے لئے اختیار کئے جائیں۔

اسلام کے دعوائے آفاقیت (عالمگیریت) کی کھلی ہوئی تردید ہے، اسلام نوع انسانی کا دین ہے اور اس کے احکام و اعمال کسی خاص قوم اور خاص عہد کی حالت کو سامنے رکھ کر اختیار نہیں کئے گئے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ مذہب کے ظواہر و رسوم کو میکانکی

طریق سے ادا کر لینے کا نام اتباعِ احکام نہیں۔ یہ ظواہر و رسوم جسم کی مثل ہیں جس میں روح کا ہونا نہایت ضروری ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کے احکام حضورؐ کے زمانہ کے اہل عرب کے حالاتِ زندگی کے پیش نظر اختیار کئے گئے تھے اور آج انہیں کوئی اہمیت حاصل نہیں اور نجات و سعادت میں انہیں کوئی دخل نہیں۔ کوئی جاہل ہوتا تو اسے ہم سمجھاتے بھی۔ حیران ہیں کہ جناب آزاد جیسے سمجھدار انسان کو ہم کیسے سمجھائیں کہ اسلام ایک نظام کا نام ہے۔ اور نظام کا ہر جزو، کُل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ احکامِ قرآنی اس نظامِ اسلامی کے لاینفک اجزاء ہیں اور دنیا کے کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکے یا اسلام کے دعوے کیساتھ ساتھ یہ بھی جائز قرار دے کہ ''نجات و سعادت'' ان اعمال و احکام کے علاوہ اور طرح سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ ''نجات و سعادت'' اسلامی نظام کا فطری نتیجہ ہے۔ اس نظام کے جزئیات کو بدل دیجئے یہ نتیجہ خود بخود بدل جائے گا۔ جب قرآن یہ کہتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اسلام کے سوا کوئی اور دین قابل قبول نہیں، تو اس سے مقصود اسلامی نظام ہے نہ کہ ''خدا پرستی اور نیک عملی'' کے مبہم اور غیر متعین الفاظ۔ قرآن کریم کھولئے اور دیکھئے کہ اس میں ان احکام کی ''پابندیوں'' کو کتنی اہمیت دی گئی ہے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اہل کتاب خدا کو بھی مانتے تھے اور اپنے خیال کے مطابق نیک اعمال بھی کرتے تھے۔ بایں ہمہ مسلمانوں کو (خاص حالات کے ماتحت) جس طرح کفار اور مشرکین سے قتال کا حکم دیا گیا اسی طرح ان اہل کتاب سے بھی قتال کا حکم دیا گیا۔ اس حکم کے وقت اہل کتاب کے خلاف جو فرد جرم (چارج شیٹ) عائد کی گئی ہے اسے ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے:۔

قاتلوا الذين لا يومنون بالله ولا باليوم الاخرو لا يحرمون ما حرم الله و رسوله ولا يدينون دين الحق من الذين اوتوا الكتاب حتى يعطوا الجزية عن يد وهم صاغرون۔(۹/۲۹)۔

اہل کتاب جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر، اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو خدا اور رسول نے حرام بتایا ہے اور نہ سچے دین کو ہی قبول کرتے ہیں، ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہو کر جزیہ دینا قبول کر لیں۔

اس آیۂ جلیلہ سے حسب ذیل امور کی تصریح ہو گئی:۔

(۱) اہل کتاب ہر چند خدا اور آخرت پر ایمان کے مدعی تھے (اور ہیں) لیکن قرآن کریم انکے اس ایمان کو ایمان ہی قرار نہیں دیتا۔ اس لئے کہ جیسا کہ شقِ اول میں بتایا جا چکا ہے قرآن کریم کی رو سے ایمان وہی ایمان ہے جو اس طریق پر لایا جائے جو قرآن نے بتایا ہے۔

(۲) اہلِ کتاب کا اس طرح پر ایمان نہ لانے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ حرام و حلال میں ان پابندیوں کو ملحوظ نہیں رکھتے جو قرآن کریم نے عائد کی ہیں۔ اس سے واضح ہو گیا کہ اسلام صرف ''خدا پرستی اور نیک عملی'' (بزعمِ خویش) کا نام نہیں بلکہ قرآن کریم کے تشریعی احکام کی پابندی بھی ضروری ہے۔

(۳) تیسرے ٹکڑے میں اس امر کی وضاحت بیان فرما دی کہ ان لوگوں کا اپنے اپنے طریقہ پر خدا پرست بن جانا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ ان کے لئے دین الحق قبول کرنا نہایت ضروری ہے۔ یعنی اسلام میں داخل ہونا لازمی شرط ہے۔ دین الحق اس مذہب کا نام ہے جو نبی اکرمؐ کی وساطت سے دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں اسی دین کے لئے استعمال ہوئے ہیں ملاحظہ ہو (۳۳/۹، ۲۸/۴۸،

۹/۶۱)۔

مندرجہ صدر آیت کا مطلب بالکل واضح ہے۔ لیکن چونکہ یہ حقیقت جناب آزاد کے نظریہ کے خلاف جاتی تھی اس لئے انہوں نے اپنے ترجمہ میں ایسا اضافہ فرمایا ہے جس سے اس کا مفہوم یکسر بدل جاتا ہے۔ وہ اس آیت کا ترجمہ یوں لکھتے ہیں:

> اہل کتاب میں سے جن لوگوں کا یہ حال ہے کہ نہ تو خدا پر (سچا) ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت کے دن پر، نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے (ان کی کتاب میں) حرام ٹھہرا دیا ہے اور نہ ہی سچے دین پر عمل پیرا ہیں..... (ترجمان القرآن، صفحہ ۸۲)۔

ذرا غور فرمایئے۔ ترجمہ میں چار لفظوں کے اضافہ نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ ''یہ لوگ ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے۔'' یعنی قرآن کریم میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے یہ لوگ انہیں حرام نہیں سمجھتے لیکن جناب آزاد نے یہ کہہ کر کہ ''جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے (ان کی کتاب میں) حرام ٹھہرا دیا ہے۔'' یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن صرف یہ چاہتا ہے کہ یہ لوگ ان چیزوں کو حرام سمجھیں جو ''ان کی کتاب میں'' حرام ٹھہرائی گئی ہیں۔ اندازہ فرمایئے قرآن کریم پر یہ کتنا بڑا اضافہ ہے اور اس اضافہ کی کتنی بڑی جرأت! یہ ہے تفسیر کا وہ طریقہ جس سے یہ حضرات اپنے نظریوں کو قرآنی ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اور نہیں ڈرتے کہ یہ جرأت کس قدر بے باک ہے!

☆☆☆☆☆☆☆

گذشتہ اوراق میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) قرآن کریم کی رو سے اجزائے ایمانیہ پانچ ہیں۔ قرآن میں کسی جگہ خواہ ان میں سے ایک کا ذکر ہو یا ایک سے زیادہ کا۔ مقصود اس سے پانچوں اجزاء ہیں۔ ان میں سے ایک کا انکار بھی کفر ہے۔

(۲) ان پانچ اجزائے ایمانیہ میں نبی اکرمؐ کی رسالت اور قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان بھی جزو لاینفک ہے۔

(۳) ایمان سے مفہوم صرف اقرار کر لینا نہیں بلکہ اس کے ساتھ اطاعت بھی ہے۔

(۴) ہر رسول اور ہر کتاب کی اطاعت اپنے اپنے وقت میں تھی اور نبی اکرم ﷺ کے بعد اطاعت، خدا کی آخری کتاب قرآن کریم کی ہوگی نہ کہ پہلی کتابوں کی۔

(۵) قرآن کے تشریعی احکام نظامِ اسلامی کا ضروری جزو ہیں اور ان کی اطاعت لازمی ہے۔

ان تصریحات کو سامنے رکھنے کے بعد اب اس آیت کا مطلب سمجھئے جو اس باب میں اس جدید نظریہ (یکسانیتِ مذہب) کے مؤیدین کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔

ان الذین امنوا والذین ھادوا والنصاریٰ والصابئین من امن باللہ والیوم الاخر وعمل صالحا فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ○

تحقیق جو لوگ ایمان والے ہیں اور یہود اور نصاریٰ اور صابئین اور جو شخص بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور عمل اچھے کرے ان کا

اجران کے اللہ کے پاس ہے اوران کو کسی قسم کا خوف وحزن نہیں۔

اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہود ونصاریٰ اور صابئین سے صرف ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا مطالبہ ہے قرآن پر ایمان لانے کا مطالبہ نہیں۔ جو کچھ ہم اس وقت تک لکھ چکے ہیں اس کے پیش نظر اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھنے میں دقت نہ ہو گی۔ پہلی چیز تو یہ کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت صرف انہی دو اجزاء پر ایمان مقصود نہیں بلکہ ان کے اندر پانچوں اجزائے ایمانیہ شامل ہیں۔ قرآن شریف میں جہاں بھی ایمان کا تقاضا ہے مکمل ایمان کا ہے اور اس مکمل ایمان کے متعلق تصریحاً ارشاد موجود ہے کہ **فان امنوا بمثل ما امنتم به فقد اهتدوا** (اگر یہ لوگ ایسا ایمان لائیں جیسا تم لائے ہو پھر یہ ہدایت پر سمجھے جائیں گے۔)

دوسرے یہ کہ اگر اس سے صرف اللہ اور آخرت پر ایمان ہی کا مطالبہ ہو تو آیت میں یہود ونصاریٰ کے علاوہ خود مسلمانوں کا بھی ذکر ہے تو کیا مسلمانوں سے بھی یہی مطالبہ ہے کہ وہ فقط اللہ اور آخرت پر ایمان رکھیں! اگر ان سے بھی یہی مطالبہ ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن پر ایمان کا مطالبہ کن سے ہوگا!

آیت کا مطلب واضح ہے۔ اسلام سے پہلے لوگوں نے مذہب کو نسلوں (قوموں) کے اندر مقید کر رکھا تھا۔ توریت' قوم بنی اسرائیل (یہود) کے لئے۔ مذہبِ عیسوی بھی انہی کے لئے' کیونکہ انجیل میں یہ قول حضرت عیسیٰؑ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ ''میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لئے آیا ہوں۔ بیٹوں کی روٹی کتوں کے آگے نہیں ڈالی جا سکتی۔'' ہندوؤں کے ہاں انسانوں کی تقسیم ہی پیدائشی ورنوں کی رو سے ہوتی ہے اور ورنوں کی یہ کیفیت کہ نچلے ورن کا ہندو' نہ اوپر کے ورن میں جا سکتا ہے اور نہ ہی خدا کے حرمِ قدس میں اس کے لئے باریابی کی کوئی راہ کھلی ہے۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی مذہبی عقائد میں داخل ہو چکا تھا کہ ایک شخص محض یہودیوں کے ہاں پیدا ہو جانے سے ابناء اللہ (خدا کی اولاد) میں داخل ہو کر نجات کا مستحق ہو جاتا ہے۔ عیسائی کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے کی نجات کے ذمہ دار حضرت مسیح علیہ السلام بن جاتے ہیں۔ ایک پیدائش کی رو سے برہمن ہے۔ یعنی مذاہب عالم میں یہ عقیدہ موجود تھا کہ:

(۱) نجات وسعادت محض ایک خاص فرقہ کے گھر میں پیدا ہو جانے سے مل جاتی ہے اور

(۲) اس فرقہ کے باہر کا انسان چونکہ اس فرقہ میں داخل نہیں ہو سکتا (کیونکہ فرقہ میں داخلہ تو صرف پیدائش کی رو سے ہوتا ہے) اس لئے اس پر نجات کے سب دروازے بند ہیں (واضح رہے کہ ہندوؤں اور یہودیوں میں تبلیغ کا تصور ہی نہیں اور عیسائیوں کے ہاں بھی تبلیغ بعد کی چیز ہے)۔

قرآن نے آکر ان نظریات کی تردید کی اور اعلان کر دیا کہ نجات کو پیدائش سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی کسی کے گھر میں پیدا ہو (یہودی' نصرانی' صابی وغیرہ) وہ ایمان لانے سے اسلام کے دائرہ میں کھلے بندوں داخل ہو سکتا ہے اور اعمال صالحہ کرنے سے جنت کا اہل بن جاتا ہے۔

﴿من امن بالله واليوم الاخر وعمل صالحا فلهم اجرهم عند ربهم ولا خوف عليهم ولا هم يحزنون ۝﴾ باقی رہے

مسلمان' سوانہیں بھی اس زعمِ باطل میں نہیں رہنا چاہئے کہ وہ محض اس لئے کہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو گئے ہیں' نجات کے حقدار بن جائیں گے۔ انہیں بھی اپنے آپ کو صاحبِ ایمان ثابت کر کے اعمال صالحہ کے ذریعہ جنت کا مستحق بنانا ہو گا۔ خود مسلمانوں سے ایمان کا مطالبہ صرف اسی ایک مقام پر نہیں بلکہ اور آیات میں بھی ہے۔ مثلاً سورۂ نساء میں ہے:۔

یایھا الذین امنوا امنوا باللہ ورسولہ والکتاب الذی نزل علی رسولہ والکتب الذی انزل من قبل (۴/۱۳۶)۔

اے مسلمانوں (ایمان والو) ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس کے رسول پر نازل کی گئی اور ان کتابوں پر جو اس سے پیشتر نازل کی گئیں۔

سورۂ توبہ میں ایمان کی اس حقیقت کو اور بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا ایمان محض زبان تک محدود تھا۔ نہ دل کی گہرائیوں میں اس کا سرچشمہ تھا اور نہ اعمال حیات اس کے مصدق (انہیں منافقین کہا گیا ہے) زندگی کے باقی شعبوں میں تو خیر پھر بھی یہ نقاب پوشانہ روش کسی نہ کسی طرح نبھ جاتی تھی۔ لیکن میدانِ جہاد ایمان کی بہت بڑی کسوٹی تھی۔ اس موقع پر یہ لوگ ادھر ادھر کی بہانہ تراشیوں سے بچ کر نکل جانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ اصطلاحی ''مسلمان'' تھے۔ ایمان کا اقرار زبانی ہی زبانی تھا۔ ان کے مقابل میں وہ پکے مسلمان تھے جو مشکل سے مشکل مقام پر اپنے ایمان کا زندہ ثبوت پیش کرتے تھے۔ ان ہر دو فریق کے متعلق فرمایا:۔

لا یستاذنک الذین یومنون باللہ والیوم الاخر ان یجاھدوا باموالھم وانفسھم ..... فی ریبھم یترددون (۹/۴۴۔۴۵)۔

جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اپنے مال و جان سے جہاد کرنے کے بارے میں تم سے اجازت نہ مانگیں گے اور اللہ متقیوں کو جانتا ہے۔ (جہاد میں نہ جانے کے لئے) صرف وہی لوگ تم سے اجازت مانگیں گے جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ سو وہ اپنے شک میں حیران و متردد ہیں۔

اس آیۂ مقدسہ سے دو تین باتیں واضح طور پر سامنے آ گئیں۔

(۱) ظاہر ہے کہ وہ اہل ایمان (سچے مسلمان) جو جہاد میں مال و جان سے شریک ہوتے تھے' اللہ اور آخرت کے علاوہ ملائکہ' کتب اور رسل پر بھی ایمان رکھتے تھے۔ لیکن یہاں صرف ان کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ہی کا ذکر کافی سمجھا گیا ہے۔

(۲) منافقین وہ لوگ تھے جو زبان سے تمام اجزائے ایمانیہ کا اقرار کرتے تھے' مسلمان کہلاتے تھے۔ انہی میں رہتے تھے لیکن قرآن ان کے ایمان کو ایمان نہیں تسلیم کرتا اور واضح طور پر اعلان کرتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ''اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔''

(۳) لہٰذا جب مسلمانوں سے کہا جائے گا کہ ''اللہ اور آخرت پر ایمان لاؤ اور نیک اعمال کرو'' تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ تمہارا ''پیدائشی'' مسلمانوں ہونا یا محض زبان سے ایمان کا اقرار کر لینا کافی نہیں۔ ایمان دل سے ہونا چاہئے اور اعمالِ زندگی سے اس کی تصدیق ہونی چاہئے۔ یہ ہیں سچے مومن۔

انما المومنون الذین امنوا باللہ ورسولہ ثم لم یرتابوا وجاھدوا باموالھم وانفسھم

فی سبیل اللہ۔ اولئک ھم الصادقون o
(۴۹/۱۵)۔

مومن تو صرف وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں اور پھر (اس ایمان میں) انہیں کسی قسم کا شک وشبہ نہ رہے اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور جان سے جہاد کریں۔ یہ لوگ ہیں سچے (مسلمان)۔

ان تصریحات کی روشنی میں اب ذرا فریقِ مقابل کے نظریہ کا تجزیہ کیجئے یعنی ایک مسلمان کے لئے ''نجات و سعادت'' حاصل کرنے کے لئے ایسی کڑی شرطیں ہیں کہ وہ اس انداز کا ایمان لائے جیسا قرآن کریم نے متعین کیا ہے۔ پھر زندگی کے ہر ہر قدم پر اسی بارگاہ سے فیصلہ طلب کرے اور ان فیصلوں کو بطیبِ خاطر منظور کرتا جائے۔ حرام اور حلال کی پابندیاں اپنے اوپر عائد کرے اور ان سب کے بعد مال اور جان جیسی عزیز ترین متاع کو ہر وقت ہتھیلی پر رکھے۔ اللہ کی راہ میں قربان کرنے پر آمادہ ہو۔ یعنی اپنے آپ کو ہر وقت شہادت گاہ میں تصور کرے تب جا کر کہیں ''نجات وسعادت'' کا متوقع ہو۔ اسکے برعکس ایک غیر مسلم (مثلاً ہندو) کے لئے فقط اتنا ضروری ہے کہ صبح اٹھ کر اپنے ہاں کے مروجہ طریقہ کے مطابق ''خدا کی بھگتی'' کر لے اور کبھی کبھار کچھ ''دان'' (خیرات) کر دے۔ مثلاً چڑیوں کو دانہ ڈال دیا۔ سانڈ کے لئے چارہ خرید دیا۔ کیڑوں مکوڑوں کے استھانوں پر آٹا ڈال دیا۔ اس سے آگے بڑھے تو کہیں پیاؤ بنوا دیا۔ اور استطاعت ہوئی تو کنواں کھدوا دیا۔ سرائے یا ہسپتال بنوا دیا۔ ''دان'' (خیرات) کی کچھ ایسی ہی مدات ہیں۔ اس کے بعد اپنے اوپر نہ کوئی خاص پابندی عائد کرنے کی ضرورت نہ اسلامی احکام کی کٹھن منازل طے کرنے کی حاجت۔ نہ ہجرت کی صعوبات اٹھانا ضروری' نہ خدا کی راہ میں سر کٹوا دینے کا سوال درپیش۔ (وہاں تو بلکہ جہاد کا تصور ہی گناہ ہے کہ یہ ہمسا میں داخل ہے) یہی نہیں۔ بلکہ جہاں ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ صرف اس نظام کے ماتحت زندگی بسر کرے جو خدا کا متعین فرمودہ ہے۔ اس غیر مسلم کو کھلی اجازت ہے کہ وہ جونسا نظام اپنے لئے چاہے وضع کر لے اور جس نظام کے ماتحت چاہے زندگی بسر کرے۔ وہاں نظام' انسانی اور خدائی نظام' یا عدمِ نظام کا سوال ہی کچھ نہیں۔ اسے بس اتنا ہی کچھ کرنے کی ضرورت ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اس سے وہ نجات کا مستحق قرار پا جائے گا۔ اب سوچئے کہ جب انسانی زندگی کی تمام کدوکاوش کا منتہیٰ ٹھہرا حصولِ نجات اور یہ مقصد ایک طرف اس قدر جاں گسل اور صبر آزما مراحل طے کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہو اور دوسری طرف اتنی آسانی سے۔ تو وہ کونسا ''صحیح العقل'' انسان ہوگا جو اس قدر آسان طریقہ کو چھوڑ کر ایسا کٹھن طریق زندگی اختیار کرے گا جس میں ایک ایک سانس پر قیامت کا سامنا ہو۔ اگر نجات اسی طرح سے حاصل ہو جانی تھی تو پھر قرآن کریم میں اس قدر تفصیلی ہدایات اور احکامات کی کیا ضرورت تھی؟ اس میں فقط اتنا لکھ دینا کافی تھا کہ لوگو! خدا کی ہستی کو مانو اور اپنے اپنے طور طریقہ پر نیکی کے کام کرتے رہو۔ تمہارے لئے نجات یقینی ہے۔ اگر ''رواداری اور وسعت نظر'' کی ایسی ''صلح کل'' روش اختیار کر لی جاتی تو نہ کہیں سے مخالفت کی آواز اٹھتی نہ کوئی برسرِ پیکار ہوتا۔ نہ حضورؐ اور آپ کے متبعینؓ کو اس قدر تکالیف کا سامنا ہوتا' نہ مکہ چھوڑنا پڑتا' نہ مدنی زندگی میں اس

قدر غزوات اور سرایا کی ضرورت پڑتی۔ ساری دنیا خوش ہو جاتی اور انسانوں کو نجات کا طریقہ بھی نہایت آسان سا مل جاتا اور پھر اس کے بعد آج تک یہ جو چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی کی مسلسل ستیزہ کاری چلی آتی ہے اس کا بھی کہیں وجود نہ ہوتا۔ ساری دنیا (سوائے چند دہریوں کے جو خدا کی ہستی کے منکر ہیں) ''مومن'' ہوتی' اور کفر و اسلام' حق و باطل کا کوئی جھگڑا ہی پیدا نہ ہوتا۔

☆☆☆☆☆☆☆

''خدا پرستی اور نیک عملی'' کے مبہم الفاظ پر ذرا غور کیجئے۔ سوال یہ ہے کہ خدا پرستی کسے کہتے ہیں اور نیک عملی کیا ہے؟ کیا یہی کہ جس انداز پر کسی کا جی چاہے خدا کی پوجا (پرستش) کر لے اور جس کام کو وہ نیک سمجھتا ہے اسے اختیار اور جسے برا قرار دیتا ہے اس سے اجتناب کر لے؟

حقیقت یہ ہے کہ بعض الفاظ (یا مذہبی اصطلاحات) مسلمانوں میں رائج ہو چکے ہیں لیکن وہ اس اسلامی مفہوم کو قطعاً ادا نہیں کرتے جن کے لئے وہ شروع میں اختیار کئے گئے تھے۔ یہی نہیں کہ وہ الفاظ اسلامی تعلیم کے صحیح ترجمان نہیں بلکہ بعض اوقات ان سے ایک ایسا مفہوم مترشح ہوتا ہے جو روح اسلام کے یکسر منافی ہوتا ہے۔ انہی الفاظ میں ''پرستش'' کا لفظ بھی داخل ہے۔ دیگر ادیان میں خدا اور بندے کا تعلق پرستش اور پوجا (Worship) کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے۔ لیکن اسلام میں اس کے لئے عبودیت کا لفظ ہے جو پرستش سے الگ معنی رکھتا ہے۔ اس فرق کو نظر انداز کر دینے سے وہ تمام غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو یکسانیتِ مذاہب تک منجر ہوتی ہیں۔

اپنے سے کسی بڑی ہستی کا تصور انسان کے اندر ابتدا سے چلا آتا ہے۔ جب انسانیت اپنے عہد طفولیت میں تھی تو انسانوں کی زندگی انفرادی تھی۔ جنگلوں اور غاروں میں رہائش' پھل اور شکار ذرائع معاش۔ کسی ایک انسان کو دوسرے سے کچھ علاقہ نہیں۔ اس زندگی میں ''خدا'' کے ساتھ اتنا ہی تعلق سمجھا جاتا تھا کہ مصیبت کے وقت اس کے سامنے جھک گئے۔ خوشی کے وقت اس کے حضور ناچنے کودنے سے جشن شادمانی منعقد کر دیا۔ خدا' دیوی' دیوتاؤں کے لباس میں تھا یا بتوں کی شکل میں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ ان دیوتاؤں کو خوش رکھے۔ اس کوشش کے مظاہر کا نام پرستش یا پوجا پاٹ تھا۔ اس دوران میں جب کبھی وحی آسمانی کی روشنی آ گئی اس نے انسانی تصورات کے ان غلط عقیدوں کو اٹھا کر خدا کا صحیح تصور پیش کر دیا۔ جب وہ روشنی گم ہو گئی تو پھر وہی تاریکی چھا گئی' رفتہ رفتہ انسانیت نے کچھ اور ارتقائی منازل طے کئے اور انسانوں نے مل جل کر رہنے کی طرح ڈالی۔ اب انفرادیت سے قبائلی زندگی کی طرف رجحان ہوا۔ انسانوں کا ایک دوسرے سے تعاون و تناصر کا تعلق قائم ہوا۔ اشتراکِ عمل کی صورتیں جلوہ پیرا ہوئیں۔ اس سے باہمی حقوق اور ان کی نگہداشت کا سوال پیدا ہوا اور ان کے صحیح تعین کے لئے خدا کی طرف سے احکام بھی آنے شروع ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جس قدر انسانی مقتضیات ہوتے تھے اسی اندازہ سے احکام ملتے تھے۔ زمانہ آگے بڑھتا گیا' ان مقتضیات میں ترقی اور تبدیلی ہوتی گئی اور ان کے ساتھ ساتھ سلسلۂ احکاماتِ الٰہیہ بھی بڑھتا چلا گیا۔ ان احکام کی رو سے انسان اور خدا کے درمیان تابع اور متبوع' حاکم اور محکوم کا تعلق قائم ہوا۔ چونکہ آسمانی ہدایت زیادہ عرصہ تک انسانوں کے پاس محفوظ شکل میں نہ رہتی تھی اس

لئے احکامات کی روح مسخ ہو جاتی۔ خدا کے متعلق حاکم اور فرمانروا کا تصور بھی گم ہو جاتا اور پھر وہی ''پرستش'' کا ابتدائی تصور غالب آ جاتا۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا آنکہ انسانوں نے انفرادیت کی جگہ اجتماعیت کی زندگی اختیار کر لی اور اس کے بعد ان کی تمام جدوجہد کا منتہیٰ اجتماعیت کی تشکیل پا گیا۔ اب وقت تھا کہ انہیں ایک ایسا ضابطۂ حیات دے دیا جاتا جس میں نظامِ اجتماعیت کی مکمل ترین صورتوں کے لئے آئین و قوانین موجود ہوں۔ اس ضابطہ نے یہ بتایا کہ نظامِ اجتماعیت کے لئے جس قدر آئین وضوابط ذہنِ انسانی کی پیداوار ہوں گے وہ انسانیت کی نشوونما کے راستہ میں حائل ہوں گے۔ انسانیت کی نشوونما صرف اس ضابطہ حیات کی رو سے ہوسکتی ہے جو تشکیلِ اجتماعیت کے لئے خدا کی طرف سے عطا کیا گیا ہے اور جسے قرآن کریم کہتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ اب خدا پر ایمان رکھنے والے ہر انسان کا فریضہ ہے کہ کسی ایک انسان یا انسانوں کی جماعتوں کے وضع کردہ نظامہائے زندگی کی جگہ اس نظام کے نفاذ کے لئے جدوجہد کرے جو خدا کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ یعنی دنیا میں انسانوں کی جگہ خدا کی بادشاہت قائم ہو اور اس طرح انسان' اللہ کے سوا کسی اور کا عبد نہ بنے۔ یہ ہے خدا اور بندے کے درمیان صحیح تعلق یعنی عبد و معبود' محکوم اور حاکم کا تعلق۔ عبودیت سے مراد یہ ہے کہ اپنی تمام قوتوں کو نظامِ خداوندی کے تقاضوں کے مطابق صرف کیا جائے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ پرستش کا لفظ خدا اور بندے کے تعلق کے قرآنی مفہوم کو قطعاً ادا نہیں کرتا۔ یہی نہیں کہ صرف ادا ہی نہیں کرتا بلکہ ایک الگ مفہوم پیدا کر دیتا ہے۔ وہ مفہوم جو انسانیت کے عہدِ طفولیت کا پیدا کردہ اور اس کی انفرادی زندگی کے دور کی یادگار ہے۔ اس معنی میں ''خدا پرستی'' تو ہر مذہب میں ایک جیسی ہوسکتی ہے لیکن خدا کی عبودیت صرف اسلام میں داخل ہو کر ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ اس لئے جس ضابطۂ خداوندی کی رو سے خدا کی محکومیت اختیار کی جاسکتی ہے وہ آج قرآن کریم کے باہر اور کہیں نہیں۔ اسلام کا مطالبہ نظامِ خداوندی قائم کرنے کا ہے۔ ''خدا پرستی'' (یعنی خدا کی پوجا یا پرستش کرنے) کا نہیں۔ لہٰذا ایمان باللہ کے معنی یہ ہیں کہ ''میں اقرار کرتا ہوں کہ میں خدا کے علاوہ کسی اور کی محکومیت کو جائز نہیں سمجھتا۔'' باقی چاروں اجزائے ایمان اسی اصل کی شاخیں ہیں۔ یعنی

(۱) خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا اقرار۔	اللہ پر ایمان
(۲) یہ محکومیت اس ضابطہ کی رو سے اختیار کی جائے جو خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے' اور جس کی آخری شکل قرآن کریم ہے۔	کتابوں پر ایمان
(۳ و ۴) یہ ضوابط ملائکہ کے ذریعہ حضرات انبیائے کرامؑ پر نازل ہوتے رہے' اس سلسلہ کی آخری کڑی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔	ملائکہ اور رسولوں پر ایمان
(۵) اس طرز زندگی کا فطری نتیجہ دنیا کی سرفرازی اور آخرت کی سربلندی ہے اسی کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔	آخرت پر ایمان

یہ ہے قرآنی ایمان سے مفہوم۔ ان اجزائے ایمانیہ میں سے سب کا ذکر ہو یا کسی ایک جزو کا۔ مقصد پورے کے پورے

نظام سے ہے۔

اب رہی ''نیک عملی''، سوروحِ اسلام سے واقف ہو جانے کے بعد اس کی تعریف بھی کچھ مشکل نہیں رہتی۔ ہر وہ قدم جو دنیا میں نظامِ خداوندی قائم کرنے کے لئے اٹھے نیک ہے اور جو اس کے خلاف ہو برا ہے۔ انسان اپنے ابتدائی عہد میں جس طرح ایمان باللہ سے مفہوم صرف خدا کی پرستش (پوجا) لیتا تھا اسی طرح اس کا نیکی کا تصور بھی بہت ابتدائی تھا۔ اس زمانے میں زندگی انفرادی تھی اس لئے نیکی اور بدی بھی انفرادی اعمال کا نام تھا۔ مثلاً اگر وہ دیکھتا کہ ان میں کا ایک انسان بیماروں سے ہمدردی کرتا ہے، ضعیفوں کی مدد کرتا ہے۔ جانوروں پر شفقت کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو وہ ایسے انسان کو نیک آدمی خیال کرتا اور حقیقت یہ ہے کہ انفرادی زندگی میں نیکیاں اسی قسم کی ہوسکتی ہیں لیکن اجتماعی زندگی میں نیکی اور بدی کا معیار اس سے کہیں بلند ہو جاتا ہے۔ اس وقت یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کسی قوم کی تہذیب وتمدن کے اساس ومبانی کیا ہیں۔ وہ انسانوں کے لئے کس قسم کا نظامِ زندگی تجویز کرتی ہے۔ دنیا پر اس تہذیب ونظام کے اثرات کیا ہیں۔ اگر اس کے اثرات انسانیت کش ہیں تو اس قوم کے افراد کی ذاتی ''نیکیاں'' (مثل خیرات وغیرہ) انسانیت کی میزان میں نیکیاں نہیں قرار پاسکتیں۔ جب تک وہ لوگ اس نظام کے ممد و معاون اور دست و بازو رہیں گے، ان کا کوئی عمل، عمل صالح نہیں کہلا سکے گا کسی کی رگِ جان پر جونکیں لگا دینا کہ وہ اس کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لیں اور جب اس پر ضعف کے دورے پڑنے لگیں تو اس کے حلق میں شربت ٹپکانا، سطح بیں نگاہوں میں ہی نیکی قرار پا سکتا ہے۔ قرآن کریم نظامِ عدل کے قیام کی تعلیم دیتا ہے جس کا مفہوم تمام نوع انسانی کے مفاد کا تحفظ ہے۔ اس نظام کا نام خدا کی بادشاہت ہے۔ ایک شخص بڑا مخیّر ہے۔ اچھے اچھے کاموں میں حصہ لیتا ہے۔ غریبوں کی امداد کرتا ہے عادات وخصائل نہایت عمدہ ہیں۔ لیکن حکومت وقت کوتسلیم نہیں کرتا۔ یا اس کی جگہ کسی دوسری حکومت کے قیام کی فکر میں ہے تو حکومت کی نگاہوں میں یہ جرم ایسا سنگین ہے کہ اس کی ''ذاتی نیکیاں'' اس کے مقابلہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتیں۔ اگر اس کے خلاف یہ جرم ثابت ہو جائے تو اسے سخت ترین سزا دی جائے گی۔

خدا کی بادشاہت کے ماتحت زندگی بسر کرنے کا نام ایمان ہے اور اس کے خلاف زندگی کا نام کفر۔ اب آپ خود ہی اندازہ فرمالیجئے کہ کفر میں زندگی بسر کرنے والے کی ذاتی نیکیاں میزان خداوندی میں کیا وزن رکھ سکتی ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے کہ **اولئک حبطت اعمالھم** (یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال رائگاں جاتے ہیں) یعنی جن اعمال کو وہ بزعمِ خویش نیک سمجھتے ہیں وہ دراصل نیک ہوتے ہی نہیں، اس لئے ان کا نتیجہ بھی کچھ نہیں نکلتا۔ آپ چاک کو کونین سمجھ کر صبح وشام پھانکتے رہئے، ملیریا کبھی دور نہیں ہوگا۔

والذین کفروا اعمالھم کسراب........
فمالہ من نور۔(۴۰-۳۹/۲۴)۔

جو لوگ ایمان نہیں رکھتے ان کے اعمال ایک صحرا میں سراب کی طرح ہیں جسے ایک پیاسا پانی سمجھتا ہے (اور اس کی طرف جاتا ہے) لیکن جب اس کے پاس جاتا ہے تو وہاں کوئی (اصلی)

چیز اسے نظر نہیں آتی۔ (البتہ) وہاں اللہ نظر آتا ہے جو اسے پورا پورا حساب دیتا ہے کیونکہ وہ بہت سریع الحساب ہے۔ یا (ان کے اعمال) ایک بحر ذخار میں گھٹا ٹوپ اندھیرے کی طرح ہیں جہاں موج پر موج متلاطم ہو اور ان کے اوپر (سیاہ) بادل تو بر تو ظلمات (ایسا کہ) جب وہ اپنا ہاتھ باہر نکالے تو سجھائی نہ دے (اور حقیقت یہ ہے کہ) جسے اللہ روشنی نہ دے اسے کہیں سے روشنی نہیں مل سکتی۔

اس لئے کہ یہ لوگ نظام حیات کو اعمالِ حیات سے الگ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اعمال وہی نتیجہ خیز ہیں جو صحیح نظام کے تابع ہوں۔ نظام سے الگ ہٹ کر انفرادی اعمال کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ سورۂ توبہ کے تیسرے رکوع کو دیکھئے کیسے دل نشین انداز میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ اس نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:۔

اجعلتم سقاية الحاج..... الظلمين۔
(۹/۱۹)۔

کیا تم خیال کرتے ہو کہ حاجیوں کو پانی پلانا (سبیلیں لگوا دینا) یا خانۂ کعبہ کی خدمت (کرنے والا) اس شخص کے برابر ہے جو اللہ اور آخرت (نظامِ خداوندی) پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے راستے میں جدوجہد کرتا ہے (تمہاری سطح بیں نگاہیں کچھ ہی کہیں) اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ ظالمین کو کبھی ہدایت نہیں دیتا۔

قرآن کریم کے متعدد مقامات میں ان امور کی تصریحات موجود ہیں۔ اس سے واضح ہو گیا ہو گا کہ قرآنی معیار کے مطابق ''نیک عملی'' کسے کہتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

ان تصریحات کو سامنے رکھئے اور پھر غور فرمائیے کہ یہ نظریہ کہ نجات و سعادت کے لئے کسی خاص نظامِ زندگی کی ضرورت نہیں ''خدا پرستی اور نیک عملی'' جو اصولی طور پر ہر مذہب میں یکساں موجود ہے' نجات کے لئے کافی ہے' کس قدر قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ واضح رہے کہ یہ دعویٰ کہ اسلام کو باقی ادیان پر افضلیت و فوقیت حاصل ہے کسی مذہب کے خلاف عداوت پیدا کرنے کا موجب نہیں ہو سکتا۔ اسلام محض اختلافِ مذاہب کی بنا پر عداوت نہیں سکھاتا' وہ تو امن و سلامتی کا پیامبر ہے۔ اس کے اس دعوے کا اعلان و تبلیغ نوعِ انسان کی ہمدردی اور بہی خواہی ہے۔ جیسے آپ کسی مریض سے کہیں کہ بھائی تمہارا مرض ادھر ادھر کے بے قاعدہ علاج سے نہیں جائے گا۔ اس کے لئے فلاں طبیب کی طرف رجوع کرو۔ وہی ان امراض کا ماہر ہے اور اسی کے ہاں اصلی نسخے مل سکتے ہیں۔ یہ مشورہ مریض سے عداوت نہیں بلکہ محبت پر مبنی ہے۔ عداوت تو اسی کی طرف سے ہو گی جو یہ کہے گا کہ نہیں سب دواخانے ایک ہی جیسے ہیں جہاں سے جی چاہے نسخہ لکھواؤ اور دوائی خرید لو۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ جب دوائی خانوں کے اصلی مالک نے اعلان کر دیا کہ اب صحیح نسخے صرف فلاں دواخانہ سے مل سکیں گے (باقی دواخانے ہمارے نام سے ناجائز فائدہ اٹھا کر دھوکا دیتے ہیں) تو ہر دواخانے کو ایک جیسا بتانا مالک کے اس اعلان کی تکذیب اور مریض سے کھلی ہوئی دشمنی ہے۔ **وفيها ايات لقوم يعقلون۔**

☆☆☆☆☆☆☆

اس مقالہ میں اسلام کے لئے بھی ''مذہب'' کا لفظ لکھ دیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے' اسلام درحقیقت مذہب نہیں' دین ہے۔ اس لئے اسلام کا مذاہب عالم کے

ساتھ مقابلہ ہی غلط ہے۔ جب یہ مذہب ہے ہی نہیں تو مذاہب کے ساتھ اس کا مقابلہ کیسا؟ یہ دین ہے اور دین کے معنی ہیں نظام حیات۔ اس لئے اسلام کا مقابلہ کرنا ہو تو دنیا کے دیگر نظامہائے حیات کے ساتھ کرنا چاہئے۔ ابوالکلام صاحب آزاد اور ان کی اتباع میں اور لوگوں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ اسلام کو بھی مذہب تصور کرتے ہیں۔ جب اسے ایک مذہب تصور کر لیا جائے تو پھر واقعی اسلام میں اور دیگر مذاہب میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اس صورت میں اسلام کی افضلیت ثابت کرنا بے سود کوشش ہے۔ جب مقصد پوجا پاٹ ٹھہرا تو پوجا مندر میں کر لی تو کیا اور مسجد میں کر لی تو کیا۔ جب مقصود یاترا ہو جائے تو ہردوار چلے گئے تو کیا اور مکے ہو آئے تو کیا۔ جب مطلب دان (خیرات) سے ہو تو کسی کو بھیک دے دی تو کیا اور زکوٰۃ دے دی تو کیا۔ اس تصور کے ماتحت فی الواقعہ ''خدا پرستی اور نیک عملی'' سب جگہ ایک جیسی رہ جاتی ہے بلکہ اس کے لئے ''خدا پرستی'' کی شرط بھی بے معنی ہو جاتی ہے۔ ضوابطِ اخلاق (سچ بولو۔ جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ حرام نہ کھاؤ۔ زنا نہ کرو) ہر جگہ یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ جو لوگ خدا کے منکر ہیں وہ بھی ان ضوابط کو اچھا کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے ''خدا پرستی'' بھی کچھ ضروری نہیں رہتی۔ ان ضوابط اخلاق کا نام ''سچا دین'' قرار پا جاتا ہے۔ چونکہ مسلمانوں میں ایک مدت سے یہ عقیدہ چلا آتا ہے کہ اسلام بھی ایک مذہب ہے اس لئے ان کے ہاں بھی خدا سے صرف پوجا پاٹ کا تعلق باقی رکھا جاتا ہے اور ''نیک عملی'' ان ضوابط اخلاق کا نام رکھ لیا جاتا ہے۔ چند عقائد' چند عبادات کی شکلیں اور وہ اخلاقی احکام جو ہر جگہ عام ملتے ہیں۔ بس ان کے مجموعے کا نام ہے اسلام۔ اس اسلام میں اور دیگر مذاہب میں کچھ فرق نہیں۔ ابوالکلام صاحب کے پیش نظر بھی اسلام کا یہی تصور تھا اس لئے ان کا نتیجۂ مستخرجہ بھی ٹھیک تھا کہ اسلام اور دیگر مذاہب میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں اور باقی مولویوں میں فرق صرف اتنا ہوا کہ انہوں نے اس بات کا اعلان کر دیا اور دوسروں نے اپنے اندر اتنی جرأت نہیں پائی۔ ورنہ عملاً ہر مولوی کا یہی عقیدہ ہے خواہ وہ زبان سے اس کا اقرار کرے یا نہ کرے۔ یا یوں کہئے کہ ان کے عقیدے کا لازمی نتیجہ وہی ہے جس کا اعلان آزاد صاحب نے کر دیا ہے۔

لیکن جب یہ سمجھ لیا جائے کہ اسلام مذہب نہیں' ایک نظامِ حیات ہے تو پھر اس بنیاد پر جو عمارت اٹھتی ہے وہ اس اسلام سے بالکل مختلف ہوتی ہے جس کا تصور آزاد صاحب پیش کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر نظامِ حیات ایک خاص ذہنیت کا مقتضی ہوتا ہے جب تک وہ ذہن پیدا نہ ہو' اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ ایمان اس خاص ذہنیت کو کہتے ہیں جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ قرآن کی رو سے تمام نوعِ انسانی کے لئے ایک ہی نظامِ حیات ہے۔ لہٰذا تمام نوعِ انسانی کے لئے ایک ہی اندازِ ایمان ہے۔ اسلام کے اس قرآنی تصور کی رو سے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ نظام ہر قوم اور مذہب میں ایک جیسا ہے۔ یہ نظام قرآن کے علاوہ کہیں اور ہے ہی نہیں۔ اس لئے تقابل کا سوال ہی سامنے نہیں آتا۔

یہ ہے وہ بنیادی غلطی جس پر ابوالکلام صاحب آزاد کی برہموسماجی تفسیر کی پوری عمارت اٹھتی ہے۔

خوانندگانِ کرام!

آئندہ صفحات میں ''مطالب الفرقان فی دروس القرآن'' کی جلد سورۃ النحل کے ابتدائی صفحات بطور نمونہ آپ کی خدمت میں پیش کئے جا رہے ہیں' جن میں اس کتاب کا تعارف اور پیش لفظ شامل ہیں۔ کتاب خوبصورت گیٹ اپ اور مضبوط جلد کے ساتھ 68 گرام سفید کاغذ پر شائع کی گئی ہے۔ سائز 8/30x20 ہے اور کل صفحات 334 ہیں قیمت 135 روپے فی جلد رکھی گئی ہے جو کہ ادارہ طلوع اسلام 25 بی' گلبرگ 2' لاہور سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

(ادارہ)

SPEECH BY THE PRIME MINISTER OF MALAYSIA THE HON. DATO SERI DR MAHATIR MUHAMMAD AT THE OPENING OF THE TENTH SESSION OF THE ISLAMIC SUMMIT CONFERENCE PUTRAJAYA MALAYSIA

20 SHAABAN 1424H (16 OCTOBER 2003) 10.00 AM.

Alhamdulillah, All Praise be to Allah, by whose Grace and Blessings we, the leaders of the Organisation of Islamic Conference countries are gathered here today to confer and hopefully to plot a course for the future of Islam and the Muslim ummah worldwide.

2. On behalf of the Government and the people of many races and religions of Malaysia, may I extend a warm welcome to all and everyone to this Tenth Session of the Islamic Summit Conference in Putrajaya, Malaysia's administrative capital.

3. It is indeed a great honour for Malaysia to host this Session and to assume the Chairmanship of the Organisation of the Islamic Conference (OIC). I thank the members for their confidence in Malaysia's Chairmanship.

4. May I also take this opportunity to pay a special tribute to the State of Qatar, in particular His Highness Shaikh Hamad Bin Khalifa AI-Thani, the Emir of the State of Qatar, for his outstanding stewardship of our Organisation over the past three years.

5. As host, Malaysia is gratified at the high level of participation from member countries. This clearly demonstrates our continued and abiding faith in, and commitment to our Organisation and our collective wish and determination to strengthen our role for the dignity and benefit of the ummah.

6.I would also like to welcome the leaders and representatives of the many countries who wish to become observers at this meeting because of their substantial Muslim population. Whether they are Muslims or not, their presence at this meeting will help towards greater understanding of Islam and the Muslims, thus helping to disprove the perception of Islam as a religion of backwardness and terror.

7. The whole world is looking at us. Certainly 1.3 billion Muslims, one-sixth of the world's population are placing their hopes in us, in this meeting, even though they may be cynical about our will and capacity to even decide to restore the honour of Islam and the Muslims, much less to free their brothers and sisters from the oppression and humiliation from which they suffer today.

8. I will not enumerate the instances of our humiliation and oppression, nor will I once again condemn our detractors and oppressors. It would be an exercise in futility because they are not going to change their attitudes just because we condemn them. If we are to recover our dignity and that of Islam, our religion, it is we who must decide, it is we who must act.

9. To begin with, the Governments of all the Muslim countries can close ranks and have a common stand if not on all issues, at least on some major ones, such as on Palestine. We are all Muslims. We are all oppressed. We are all being humiliated. But we who have been raised by Allah above our fellow Muslims to rule our countries have never really tried to act in concert in order to exhibit at our level the brotherhood and unity that Islam enjoins upon us.

10. But not only are our Governments divided, the Muslim ummah is also divided, and divided again and again. Over the last 1400 years the interpreters of Islam, the learned ones, the ulamas have interpreted and reinterpreted the single Islamic religion brought by Prophet

Muhammad S.A.W, so differently that now we have a thousand religions which are often so much at odds with one another that we often fight and kill each other.

11. From being a single ummah we have allowed ourselves to be divided into numerous sects, mazhabs and tarikats, each more concerned with claiming to be the true Islam than our oneness as the Islamic ummah. We fail to notice that our detractors and enemies do not care whether we are true Muslims or not. To them we are all Muslims, followers of a religion and a Prophet whom they declare promotes terrorism, and we are all their sworn enemies. They will attack and kill us, invade our lands, bring down our Governments whether we are Sunnis or Syiahs, Alawait or Druze or whatever. And we aid and abet them by attacking and weakening each other, and sometimes by doing their bidding, acting as their proxies to attack fellow Muslims. We try to bring down our Governments through violence, succeeding to weaken and impoverish our countries.

12. We ignore entirely and we continue to ignore the Islamic injunction to unite and to be brothers to each other, we the Governments of the Islamic countries and the ummah.

13. But this is not all that we ignore about the teachings of Islam. We are enjoined to Read, Iqraq i.e. to acquire knowledge. The early Muslims took this to mean translating and studying the works of the Greeks and other scholars before Islam. And these Muslim scholars added to the body of knowledge through their own studies.

14. The early Muslims produced great mathematicians and scientists, scholars, physicians and astronomers etc. and they excelled in all the fields of knowledge of their times, besides studying and practising their own religion of Islam. As a result the Muslims were able to develop and extract wealth from their lands and through their world trade, able to strengthen their defences, protect their people and give them the Islamic way of life, Addin, as prescribed by Islam. At the time the Europeans of the Middle Ages were still superstitious and backward, the enlightened Muslims had already built a great Muslim civilisation, respected and powerful, more than able to compete with the rest of the world and able to protect the ummah from foreign aggression. The Europeans had to kneel at the feet of Muslim scholars in order to access their own scholastic heritage.

15. The Muslims were lead by great leaders like Abdul Rahman III, AI-Mansur, Salah El Din AI Ayubi and others who took to the battlefields at the head of their forces to protect Muslim land and the ummah.

16. But halfway through the building of the great Islamic civilisation came new interpreters of Islam who taught that acquisition of knowledge by Muslims meant only the study of Islamic theology. The study of science, medicine etc. was discouraged.

17. Intellectually the Muslims began to regress. With intellectual regression the great Muslim civilisation began to falter and wither. But for the emergence of the Ottoman warriors, Muslim civilisation would have disappeared with the fall of Granada in 1492.

18.The early successes of the Ottomans were not accompanied by an intellectual renaissance. Instead they became more and more preoccupied with minor issues such as whether tight trousers and peak caps were Islamic, whether printing machines should be allowed or electricity used to light mosques. The Industrial Revolution was totally missed by the Muslims. And the regression continued until the British and French instigated rebellion against Turkish rule brought about the downfall of the Ottomans, the last Muslim world power and replaced it with European colonies and not independent states as promised. It was only after World War II that these colonies became independent.

19. Apart from the new nation-states we also accepted the western democratic system. This also divided us because of the political parties and groups that we form, some of which claim Islam for themselves, reject the Islam of other parties and refuse to accept the results of the practice of democracy if they fail to gain power for themselves. They resort to violence, thus destabilising and weakening Muslim countries.

20. With all these developments over the centuries the ummah and the Muslim civilisation became so weak that at one time there was not a single Muslim country which was not colonised or hegemonised by the Europeans. But regaining independence did not help to strengthen the Muslims. Their states were weak and badly administered, constantly in a state of turmoil. The Europeans could do what they liked with Muslim territories. It is not surprising that they should excise Muslim land to create the state of Israel to solve their Jewish problem. Divided, the Muslims could do nothing effective to stop the Balfour and Zionist transgression.

21. Some would have us believe that, despite all these, our life is better than that of our detractors. Some believe that poverty is Islamic, sufferings and being oppressed are Islamic. This world is not for us. Ours are the joys of heaven in the afterlife. All that we have to do is to perform certain rituals, wear certain garments and put up a certain appearance. Our weakness, our backwardness and our inability to help our brothers and sisters who are being oppressed are part of the Will of Allah, the sufferings that we must endure before enjoying heaven in the hereafter. We must accept this fate that befalls us. We need not do anything. We can do nothing against the Will of Allah.

22. But is it true that it is the Will of Allah and that we can and should do nothing? Allah has said in Surah Ar- Ra'd verse 11 that He will not change the fate of a community until the community has tried to change its fate itself.

23. The early Muslims were as oppressed as we are presently. But after their sincere and determined efforts to help themselves in accordance with the teachings of Islam, Allah had helped them to defeat their enemies and to create a great and powerful Muslim civilisation. But what effort have we made especially with the resources that He has endowed us with.

24. We are now 1.3 billion strong. We have the biggest oil reserve in the world. We have great wealth. We are not as ignorant as the Jahilliah who embraced Islam. We are familiar with the workings of the world's economy and finances. We control 57 out of the 180 countries in the world. Our votes can make or break international organisations. Yet we seem more helpless than the small number of Jahilliah converts who accepted the Prophet as their leader. Why? Is it because of Allah's will or is it because we have interpreted our religion wrongly, or failed to abide by the correct teachings of our religion, or done the wrong things?

25. We are enjoined by our religion to prepare for the defence of the ummah. Unfortunately we stress not defence but the weapons of the time of the Prophet. Those weapons and horses cannot help to defend us any more. We need guns and rockets, bombs and warplanes, tanks and warships for our defence. But because we discouraged the learning of science and mathematics etc. as giving no merit for the akhirat, today we have no capacity to produce our own weapons for our defence. We have to buy our weapons from our detractors and enemies. This is what comes from the superficial interpretation of the Quran, stressing not the substance of the Prophet's sunnah and the Quran's injunctions but rather the form, the manner and the means used in the 1st Century of the Hijrah. And it is the same with the other teachings of Islam. We are more concerned with the forms rather than the substance of the words of Allah and adhering only to the literal interpretation of the traditions of the Prophet.

26. We may want to recreate the first century of the Hijrah, the way of life in those times, in order to practise what we think to be the true Islamic way of life. But we will not be allowed to do so. Our detractors and enemies will take advantage of the resulting backwardness and weakness in order to dominate us. Islam is not just for the 7th Century A.D. Islam is for all times. And times have changed. Whether we like it or not we have to change, not by changing our religion but by applying its teachings in the context of a world that is radically different from that of the first century of the Hijrah. Islam is not wrong but the interpretations by our scholars, who are not prophets even though they may be very learned can be wrong. We have a need to go back to the fundamental teachings of Islam to find out whether we are indeed believing in and practising the Islam that the Prophet preached. It cannot be that we are all practising the correct and true Islam when our beliefs are so different from one another.

27. Today we, the whole Muslim ummah are treated with contempt and dishonour. Our religion is denigrated. Our holy places desecrated. Our countries are occupied. Our people starved and killed.

28. None of our countries are truly independent. We are under pressure to conform to our oppressors' wishes about how we should behave, how we should govern our lands, how we should think even.

29. Today if they want to raid our country, kill our people, destroy our villages and towns, there is nothing substantial that we can do. Is it Islam which has caused all these? Or is it that we have failed to do our duty according to our religion?

30. Our only reaction is to become more and more angry. Angry people cannot think properly. And so we find some of our people reacting irrationally. They launch their own attacks, killing just about anybody including fellow Muslims to vent their anger and frustration. Their Governments can do nothing to stop them. The enemy retaliates and puts more pressure on the Governments. And the Governments have no choice but to give in, to accept the directions of the enemy, literally to give up their independence of action.

31. With this their people and the ummah become angrier and turn against their own Governments. Every attempt at a peaceful solution is sabotaged by more indiscriminate attacks calculated to anger the enemy and prevent any peaceful settlement. But the attacks solve nothing. The Muslims simply get more oppressed.

32. There is a feeling of hopelessness among the Muslim countries and their people. They feel that they can do nothing right. They believe that things can only get worse. The Muslims will forever be oppressed and dominated by the Europeans and the Jews. They will forever be poor, backward and weak. Some believe, as I have said, this is the Will of Allah, that the proper state of the Muslims is to be poor and oppressed in this world.

33. But is it true that we should do and can do nothing for ourselves? Is it true that 1.3 billion people can exert no power to save themselves from the humiliation and oppression inflicted upon them by a much smaller enemy? Can they only lash back blindly in anger? Is there no other way than to ask our young people to blow themselves up and kill people and invite the massacre of more of our own people?

34. It cannot be that there is no other way. 1.3 billion Muslims cannot be defeated by a few million Jews. There must be a way. And we can only find a way if we stop to think, to assess our weaknesses and our strength, to plan, to strategise and then to counter attack. As Muslims we must seek guidance from the Al-Quran and the Sunnah of the Prophet. Surely the 23

years' struggle of the Prophet can provide us with some guidance as to what we can and should do.

35. We know he and his early followers were oppressed by the Qhuraish. Did he launch retaliatory strikes? No. He was prepared to make strategic retreats. He sent his early followers to a Christian country and he himself later migrated to Madinah. There he gathered followers, built up his defence capability and ensured the security of his people. At Hudaibiyah he was prepared to accept an unfair treaty, against the wishes of his companions and followers. During the peace that followed he consolidated his strength and eventually he was able to enter Mecca and claim it for Islam. Even then he did not seek revenge. And the peoples of Mecca accepted Islam and many became his most powerful supporters, defending the Muslims against all their enemies.

36. That briefly is the story of the struggle of the Prophet. We talk so much about following the sunnah of the Prophet. We quote the instances and the traditions profusely. But we actually ignore all of them.

37. If we use the faculty to think that Allah has given us then we should know that we are acting irrationally. We fight without any objective, without any goal other than to hurt the enemy because they hurt us. Naively we expect them to surrender. We sacrifice lives unnecessarily, achieving nothing other than to attract more massive retaliation and humiliation.

38. It is surety time that we pause to think. But will this be wasting time? For well over half a century we have fought over Palestine. What have we achieved? Nothing. We are worse off than before. If we had paused to think then we could have devised a plan, a strategy that can win us final victory. Pausing and thinking calmly is not a waste of time. We have a need to make a strategic retreat and to calmly assess our situation.

39. We are actually very strong. 1.3 billion people cannot be simply wiped out. The Europeans killed 6 million Jews out of 12 million. But today the Jews rule this world by proxy. They get others to fight and die for them.

40. We may not be able to do that. We may not be able to unite all the 1.3 billion Muslims. We may not be able to get all the Muslim Governments to act in concert. But even if we can get a third of the ummah and a third of the Muslim states to act together, we can already do something. Remember that the Prophet did not have many followers when he went to Madinah. But he united the Ansars and the Muhajirins and eventually he became strong enough to defend Islam.

41. Apart from the partial unity that we need, we must take stock of our assets. I have already mentioned our numbers and our oil wealth. In today's world we wield a lot of political, economic and financial clout, enough to make up for our weakness in military terms.

42. We also know that not all non-Muslims are against us. Some are well disposed towards us. Some even see our enemies as their enemies. Even among the Jews there are many who do not approve of what the Israelis are doing.

43. We must not antagonise everyone. We must win their hearts and minds. We must win them to our side not by begging for help from them but by the honourable way that we struggle to help ourselves. We must not strengthen the enemy by pushing everyone into their camps through irresponsible and un-Islamic acts. Remember Salah El Din and the way he fought against the so called Crusaders, King Richard of England in particular. Remember the considerateness of the Prophet to the enemies of Islam. We must do the same. It is winning the struggle that is important, not angry retaliation, not revenge.

44. We must build up our strength in every field, not just in armed might. Our countries must be stable and well administered, must be economically and financially strong, industrially competent and technologically advanced. This will take time, but it can be done and it will be time well spent. We are enjoined by our religion to be patient. Innallahamaasabirin. Obviously there is virtue in being patient.

45. But the defence of the ummah, the counter attack need not start only after we have put our houses in order. Even today we have sufficient assets to deploy against our detractors. It remains for us to identify them and to work out how to make use of them to stop the carnage caused by the enemy. This is entirely possible if we stop to think, to plan, to strategise and to take the first few critical steps. Even these few steps can yield positive results.

46. We know that the Jahilliah Arabs were given to feuding, to killing each other simply because they were from different tribes The Prophet preached the brotherhood of Islam to them and they were able to overcome their hatred for each other, become united and helped towards the establishment of the great Muslim civilisation. Can we say that what the Jahilliah (the ignorant) could do we, the modern Muslims cannot do? If not all at least some of us can do. If not the renaissance of our great civilisation, at least ensuring the security of the ummah.

47. To do the things that are suggested will not even require all of us to give up our differences with each other. We need only to call a truce so we can act together in tackling only certain problems of common interests, the Palestine problem for example.

48. In any struggle, in any war, nothing is more important than concerted and coordinated action. A degree of discipline is all that is needed. The Prophet lost in Jabal Uhud because his forces broke rank. We know that, yet we are unwilling to discipline ourselves and to give up our irregular and uncoordinated actions. We need to be brave but not foolhardy. We need to think not just of our reward in the afterlife but also of the worldly results of our mission.

49. The Quran tells us that when the enemy sues for peace we must react positively. True the treaty offered is not favourable to us. But we can negotiate. The Prophet did, at Hudaibiyah. And in the end he triumphed.

50. I am aware that all these ideas will not be popular. Those who are angry would want to reject it out of hand. They would even want to silence anyone who makes or supports this line of action. They would want to send more young men and women to make the supreme sacrifice. But where will all these lead to? Certainly not victory. Over the past 50 years of fighting in Palestine we have not achieved any result. We have in fact worsened our situation.

51. The enemy will probably welcome these proposals and we will conclude that the promoters are working for the enemy. But think. We are up against a people who think. They survived 2000 years of pogroms not by hitting back, but by thinking. They invented and successfully promoted Socialism, Communism, human rights and democracy so that persecuting them would appear to be wrong, so they may enjoy equal rights with others. With these they have now gained control of the most powerful countries and they, this tiny community, have become a world power. We cannot fight them through brawn alone. We must use our brains also.

52. Of late because of their power and their apparent success they have become arrogant. And arrogant people, like angry people will make mistakes, will forget to think.

53. They are already beginning to make mistakes. And they will make more mistakes. There may be windows of opportunity for us now and in the future. We must seize these opportunities.

54. But to do so we must get our acts right. Rhetoric is good. It helps us to expose the wrongs perpetrated against us, perhaps win us some sympathy and support. It may strengthen our spirit, our will and resolve, to face the enemy.

55. We can and we should pray to Allah S.W.T. for in the end it is He who will determine whether we succeed or fail. We need His blessings and His help in our endeavours,

56. But it is how we act and what we do which will determine whether He would help us and give us victory or not. He has already said so in the Quran. Again Surah Ar-Ra'd verse 11.

57. As I said at the beginning, the whole world is looking at us, the whole Muslim ummah is placing their hopes in this conference of the leaders of Islamic nations. They expect us not just to vent our frustrations and anger, through words and gestures; not just to pray for Allah's blessings. They expect us to do something, to act. We cannot say we cannot do anything, we the leaders of the Muslim nations. We cannot say we cannot unite even when faced with the destruction of our religion and the ummah.

58. We know we can. There are many things that we can do. There are many resources that we have at our disposal. What is needed is merely-the will to do it, As Muslims, we must be grateful for the guidance of our religion, we must do what needs to be done, willingly and with determination. Allah has not raised us, the leaders, above the others so we may enjoy power for ourselves only. The power we wield is for our people, for the ummah, for Islam. We must have the will to make use of this power judiciously, prudently, concertedly. Insyaallah we will triumph in the end.

59. I pray to Allah that this 10th Conference of the OIC in Putrajaya, Malaysia will give a new and positive direction to us, will be blessed with success by Him, Almighty Allah, Arahman, Arahirn.

==========

THE BLAME GAME

By

Ubedur Rahman Arain

USA is the Great Satan! Western culture is invading Muslim countries; America is enemy of Muslims; Bush is Israel's agent! Boycott the West; all Americans should leave the Arabian Gulf. The West is fighting a war against Islam, etc. etc. etc.

You will hear these slogans from various segments of our society. Some of them make these statements openly, while others have similar sentiments in their drawing rooms. Such statements are sometimes used to excite the masses who love Islam and are willing to do anything for its glory. No one ponders on why the West is doing this to us. Why doesn't the West like Islam and Muslims? Do they really hate us? Or are we to blame for this state of affairs?

Ramadan is a month of reflection, when the routine of life is broken and we have the opportunity to look inwards. The main purpose of fasting as described in Verse, 2:183 of the Holy Quran is "to enable development of one's personality, so that our lives are lived by His Guidance". I have been wondering about why it was necessary for this to be repeated every year? What stops us from complying with His guidance and living by it anyway? The simple answer is to either to blame the Satan, or the West. In the recent past all our shortcomings have been blamed on them and the root cause has become anonymous. I think this problem does not have an easy answer.

When I look at recent events, I find that the West we blame for all our ills, actually liberated Muslim Kuwait from the Iraqi Dictator, who had came here to loot and plunder. US saved Muslims in Bosnia and Albania from the Serbs, who were all Christians. They liberated Afghanistan from brutal gangsters and the religious zealots, who had taken that country back to the stone-age, all in the garb of Islam. And recently it liberated Muslims in Iraq from one the most brutal dictators since Hitler. They gave their lives to do all this. Scores of American, British and universities of other western countries produce hundreds of thousands of Muslim specialists in Medicine, Engineering, Commerce, IT, Business, enabling Muslim countries to go forward in their economic and social development.

Why do you think the West is doing this? Why do they lose their lives to help liberate Muslims? Why do they educate our children in their places of learning? The answer usually given is "to benefit itself"; that the "West is trying to develop its market"; that "they want to sell the goods they produce". Well, Kuwait and Iraq have oil, but what about Bosnia and Kosovo?

I agree that the primary reason in the minds of Western leaders is the benefit of their nations. Well why not. However I have not been satisfied by this simple answer for I feel there is more to this. We have failed somewhere and the vacuum that has been created, is being filled by the West. If we do not fight our own dictators, God will not leave the suppressed alone, He creates interests in other nations, so that they come and help the poor souls. They may have their interests, but the cause is provided by us. When we cannot treat our sick, build for ourselves,

educate our children, God has to make alternate plans. These are not works of the West – these are the failures of the East!

God tells us in the Holy Quran that "if you will not follow the laws of God, He will replace you with other nations who will not be like you".

We read a lot of Quran, pray, go to Hajj and fulfill our religious rituals. However, our track record on human rights, honesty, truthfulness and sacrifice for others is very poor. The result is that Muslim societies are internally very weak and over centuries have become dependent on others, instead of leading.

Let me leave it to you to decide. Is this just a coincidence or is it us, the Muslims, whose ways are being corrected by the forces promised by God! God does not want dictatorships or anarchy. If we do not correct ourselves, corrections would be imposed on us because every one eventually has to bow down to Him (3:83).

By the way, I am myself a proud Muslim and citizen of a proud Muslim country. I believe that we can solve all our problems ourselves, if we live by the values set by Him. We are forced into difficult situations when we say things we do not mean, and go against the verses: "Why do you say, what you do not" - 26:226; "It is not proper if there is contradiction between your deeds and what you say" - 61:2-3; "God forgets those who forget God" - 9:67.

Let us ponder on this.

(Courtesy Arab Times)

==========